هذا بلاغ للناس
ماهنامه
البلاغ
کراچی
سرپرست
حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم

شوال ۱۳۸۷ھ
جنوری ۱۹۶۸ء

دار العلوم کراچی کا ترجمان

ماہنامہ البلاغ کراچی

فی پرچہ ۵۰ پیسے ، سالانہ چھ روپے
ممالک غیر سے ، ایک پونڈ سالانہ
بذریعہ ہوائی ڈاک ۲ پونڈ
ڈاک کا پتہ

"البلاغ" دار العلوم کراچی ۱۴
فون ـــــــ ۳۸۱۱۷

ہندوستان کا پتہ

مولانا ظہور الحسن صاحب خانقاہ امدادیہ
تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

مدیر اعلیٰ

محمد تقی عثمانی
استاذ دار العلوم کراچی

مدیر انتظامی

خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری
ناظم نشر و اشاعت دار العلوم کراچی

جلد ــــــ (۱)

تمام عالم اسلام کیلئے یہ

عِید مُبارک

ہو

ذکر و فکر

علما اور پاپائیت

حمد و ستائش اس ذات کے لئے ہے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا

اور

درود و سلام اس کے آخری پیغمبر پر جنہوں نے اس جہاں میں حق کا بول بالا کیا

قرآن و سنت کی تشریح، تفسیر اور روز مرہ پیش آنیوالے نت نئے مسائل میں ان سے احکام مستنبط کرنا کس کا کام ہے؟ اور اس کام کے لئے کیا شرائط اور صفات (Qualifications) ضروری ہیں؟ اس ...... سوال کا جواب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک صحیح روایت سے ملتا ہے جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا:-

قلت یا رسول اللہ إن نزل بنا أمر لیس فیہ بیانٌ أمرٌ ولا نھیٌ فما تأمرني؟ قال تشاوروا الفقھاء والعابدین ولا تمضوا فیہ رأی خاصۃ. رواہ الطبراني في الأوسط ورجالہ موثقون من أھل الصحیح (مجمع الزوائد ص ۱۷۸ ج ۱ المطبع الانصاری دہلی ۱۳۰۸ھ)

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمارے درمیان کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس کا بیان (قرآن و سنت میں) موجود نہ ہو، نہ کوئی امر، اور نہ کوئی نہی، تو ایسی صورت میں میرے لئے آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو، اور اس معاملے میں انفرادی رائے کو جاری نہ کرو۔"

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح الفاظ میں یہ بیان فرمادیا ہے کہ قرآن و سنت سے احکام مستنبط کرنے کے لئے دو شرائط کسی انسان میں پائی جانی ضروری ہیں۔ ایک اس کا "فقیہ" ہونا، دوسرے "عابد" ہونا۔ پہلی شرط کی اہمیت تو بالکل ظاہر ہے۔ اس لئے کہ قرآن و سنت کی صحیح مراد وہی شخص سمجھ سکتا ہے۔ جو قرآن و سنت کا وسیع اور عمیق علم

کرکے دین شریعت کا مزاج سمجھنے کی پوری کوشش کی ہو۔ اسی طرح اس کا "عابد" یعنی اسلامی احکام پر کاربند ہونا ... بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضروری قرار دیا ہے، اس لئے کہ جو شخص خود اپنی عملی زندگی میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز نہ کرتا ہو، اور جس کے شب و روز اسلامی احکام کے مخالف ہوں۔ وہ ہرگز دین کے مزاج کو نہیں اپنا سکتا، احکام مستنبط کرنیکا کام درحقیقت حق کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ اور قرآن کریم کی تصریح کے مطابق اللہ تعالیٰ حق شناسی کی صفت اسی شخص کو عطا فرماتا ہے۔ جو اپنی زندگی میں عملی طور پر حق کا احترام کرتا ہو، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا

اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو گے تو وہ تمہیں (حق و باطل کی) تمیز عطا کر دے گا۔

اس آیت نے واضح طور پر بتلا دیا ہے کہ "تقویٰ" حق و باطل میں تمیز پیدا کرنے کی لازمی شرط ہے، اور اس کے بغیر یہ انمول ملکہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

غرض قرآن کریم کی اس آیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشاد نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بتلا دیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں جو نت نئے مسائل پیش آ سکتے ہیں، ان کا دینی اور فقہی حل تلاش کرنے کا کام وہی شخص کر سکتا ہے۔ جو ایک طرف "فقیہ" ہو، اور دوسری طرف "عابد" یا "متقی"۔

پچھلے دنوں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم صدر دارالعلوم کراچی نے اپنے ایک بیان میں اسی بات کو مختصر لفظوں میں اس طرح تعبیر فرمایا تھا کہ:

"جن مسائل کا صریح حکم کتاب و سنت میں مذکور نہیں، ان کے حل کا طریقہ اہل فتویٰ، اہل تقویٰ علماء کا باہمی مشورہ ہے، شخصی اور انفرادی رائے کا مسلمانوں پر مسلط کرنا جرم ہے۔"

( )

لیکن نہ جانے کیوں ہمارے تجدد پسند طبقے کو یہ بات بہت کھٹکتی ہے، یہ حضرات قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر اور اس سے احکام مستنبط کرنے کے لئے نہ "عالم" اور "فقیہ" یا "اہل فتویٰ" ہونے کو ضروری سمجھتے ہیں، اور نہ "عابد" یا "اہل تقویٰ" ہونے کو۔ ان کی طرف سے عرصۂ دراز سے یہ شور مچا ہوا ہے کہ:

"قرآن و سنت کی تشریح پر علماء کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہئے" ——— "اسلام میں پاپائیت نہیں ہے، اس لئے کسی خاص گروہ کو قانون سازی کا حق نہیں دیا جا سکتا" ——— "قرآن و سنت کی تشریح کا حق تمام مسلمانوں کو ہے، صرف علماء کو نہیں" ——— "علماء کو اسلام کے معاملے میں ویٹو کا حق نہیں دیا جا سکتا" وغیرہ وغیرہ۔

یہ وہ چلے ہوئے نعرے ہیں جن سے تجدد پسند طبقے کی کوئی تحریر بمشکل خالی ہوتی ہے۔

جہاں تک اس معاملے میں قرآن و سنت کی ہدایات کا تعلق ہے، ہم انہیں اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ان میں تشریح دین کے لئے "علم

اور "تقویٰ" کی شرائط پر کتنا زور دیا گیا ہے، لیکن ضروری ہے کہ ان غلط فہمیوں کی حقیقت بھی واضح کی جائے جو ان نعروں میں پنہاں ہیں، اور جن کا راگ ہمارے اہلِ تجدد صبح و شام الاپتے ہیں۔

ان کا پہلا نعرہ یہ ہے کہ:- "اسلام میں برہمنیت یا پاپائیت نہیں ہے، اس لئے علماء کے خاص گروہ کو قانون سازی کا حق نہیں دیا جاسکتا۔"

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ بات کہنے والے یا تو پاپائیت اور تھیوکریسی کے مفہوم اور اس کی اصل برائیوں سے ناواقف ہیں، یا جان بوجھ کر سادہ لوح عوام کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، جس شخص کے دل میں انصاف اور حقیقت پسندی کی ادنیٰ رمق موجود ہو وہ اس بات کو محسوس کرسکتا ہے کہ "علم" اور "فقہ" یا "تقویٰ" کسی نسل و رنگ یا کسی ذات پات کا نام نہیں ہے، جسے کوئی شخص اپنے اختیار سے حاصل نہ کرسکے، یہ ایک خاص کام کی صفاتِ اہلیت (Qualifications Eligibility) کا نام ہے جن کو ہر شخص ہر وقت حاصل کرسکتا ہے۔ اگر کسی مخصوص کام کے لئے کچھ اہلیت کی صفات مقرر کرنا آپ کے نزدیک "پاپائیت" ہے تو زندگی کا کونسا شعبہ اس "پاپائیت" سے خالی ہے۔ ملک کی صدارت اور وزارت کے لئے جو علمی قابلیت اور جو اخلاقی کردار ضروری قرار دیا جاتا ہے، پھر تو وہ بھی آپ کے نزدیک "پاپائیت" ہوگا، اور "جج" کے لئے علم قانون کی جو مہارت شرط قرار دی گئی ہے، اسے بھی "پاپائیت" کہنا پڑے گا، وکالت کا اہل بننے کے لئے کم از کم ایل۔ ایل۔ بی ہونے کو جو ضروری سمجھا گیا ہے، کہدیجئے کہ یہ بھی "پاپائیت" ہے، کسی یونیورسٹی میں پڑھانے کے لئے جو ڈگریاں لازمی قرار دی گئی ہیں، اس کے بارے میں بھی یہ فتویٰ صادر فرمادیجئے کہ اس میں "پاپائیت" کی روح کارفرما ہے، اور کسی الیکشن میں امیدواری کے لئے عمر، عقل اور اخلاقی کردار سے متعلق جو شرائط مقرر کی جاتی ہیں، اُن پر بھی یہ اعتراض اٹھادیجئے کہ ان پر "پاپائیت" کا سایہ پڑ گیا ہے۔

اگر ان تمام کاموں کے لئے اہلیت کی کچھ شرائط عائد کرنا "پاپائیت" نہیں ہے تو "تشریحِ کتاب و سنت" کے لئے "علم" اور "تقویٰ" کی شرط لگانا آخر کونسی منطق کی رو سے "پاپائیت" میں داخل ہوسکتا ہے؟

جس شخص نے "پاپائیت" اور برہمنیت کے نظام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، وہ علماءِ اسلام اور پوپ و برہمن صاحبان میں مندرجہ ذیل موٹے موٹے فرق محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

(۱) "برہمن" اور "پوپ" عملاً دونوں رنگ و نسل اور ذات پات کے ایک مخصوص طبقے کے نام ہیں۔ باہر کا کوئی شخص لاکھ کوشش اور ہزار صلاحیتوں کے باوجود اس میں شامل نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ پاپائیت کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ڈاکوؤں اور قزاقوں کو "پوپ" بنادیا گیا۔ اس کے برخلاف عالم وہ صفت ہے جسے حاصل کرنے کے لئے رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں علماء ہر رنگ اور ہر نسل میں ہوئے ہیں، یہاں تک کہ غلاموں میں بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے اور ملک و قوم کے پیشوا مانے گئے۔ اور ہمیشہ انکی فضیلت کا سبب ان کا علم و تقویٰ رہا ہے، نہ کہ کوئی مخصوص خاندان۔

(۲) پوپ کو جس مذہب کی ترجمانی کا دعویٰ ہے، اس کی تعلیمات زندگی کے بیشتر اہم مسائل میں خاموش ہیں، اس لئے پوپ کی مرضی خدا کی مرضی ہو کر رہ گئی ہے۔ جس پر کوئی دوسرا اعتراض کی انگلی نہیں اٹھا سکتا، یہی وجہ ہے کہ وہ شارحِ قانون نہیں، بلکہ ایک آزاد اور خودمختار واضع قانون ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف کتاب و سنت کے احکام ہمہ گیر، اس کے اصول و ضوابط

بعینہٖ محفوظ ہیں، کوئی عالم اگر ان اصول و ضوابط کے خلاف کوئی بات کہے تو دوسرے علماء اس کی لغزش پر گرفت کرنے کے لئے ہر وقت موجود رہے ہیں اور موجود ہیں۔

(۳) پاپائیت میں قانون سازی اور مذہب کی تشریح و تعبیر کا اختیار بالآخر فرد واحد پر جاکر ختم ہوتا ہے، تنہا اسی شخص کو "مسیح کی بھیڑوں کا گلہ بان" اور کلیسا کے موسس کا نائب قرار دیا گیا ہے، اس کے برخلاف "علماء" کسی ایک فرد کا نام نہیں جو کسی لگی بندھی تنظیم کا سربراہ ہو، بلکہ ہر وہ شخص جس نے صحیح اصولوں پر علم دین حاصل کیا ہو، عالم ہے اور وارث رسول ہے، اس لئے کوئی ایک عالم تنہا اپنی مرضی کو پوری اُمت پر مسلط کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔

پاپاؤں کی قانون سازی اور علماء کی تشریح کتاب و سنت میں اتنے عظیم الشان فرق کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص علمائے اسلام پر پاپائیت کا فقرہ چست کرے تو عقل و ہوش، حق و صداقت اور امانت و دیانت کا خدا ہی حافظ ہے۔

اسی پاپائیت والی بات کو اہلِ تجدّد کی طرف سے ایک دوسرے پیرایہ میں یوں بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ "کتاب و سنت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، اس لئے اس کی تعبیر و تشریح کا حق علماء کے لئے محفوظ نہیں کیا جاسکتا"

پراپیگنڈا کے مشاق ہیں کہ اسی کو بے تکان دہراتے چلے جارہے ہیں۔ مگر کوئی خدا کا بندہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اس اعتراض کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے ایک شخص جس نے کبھی کسی میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو۔ یہ اعتراض کرنے لگے کہ ملک میں، علاج و معالجہ پر سند یافتہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی ہے؟ مجھے بھی بحیثیت ایک انسان کے یہ حق ملنا چاہئے۔ ۔۔۔۔۔ یا کوئی عقل سے کورا انسان یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں، پُل اور بند تعمیر کرنے کا ٹھیکہ صرف ماہر انجینیروں ہی کو کیوں دیا جاتا ہے؟ میں بھی بحیثیت ایک شہری کے یہ خدمت انجام دینے کا حق دار ہوں ۔۔۔۔۔ یا کوئی عقل سے معذور آدمی یہ اعتراض اٹھانے لگے کہ قانونِ ملک کی تشریح و تعبیر پر صرف ماہرین قانون ہی کی اجارہ داری کیوں قائم کردی گئی ہے؟ میں بھی عاقل و بالغ ہونے کی حیثیت سے یہ کام کرسکتا ہوں۔

ہمیں توقع نہیں ہے کہ کوئی صحیح العقل انسان اس قسم کی باتیں کہہ سکتا ہے، اور اگر واقعۃً کوئی شخص سنجیدگی کیساتھ اپنے دل میں یہ کھٹک رکھتا ہو تو کیا اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ بلا شبہ بحیثیت ایک شہری کے تمہیں ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے، لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے سالہا سال دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے، ماہر اساتذہ سے ان علوم و فنون کو سیکھنا پڑتا ہے، اس کے لئے ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں، پہلے یہ زحمت تو اٹھاؤ، پھر بلا شبہ تم بھی یہ تمام خدمتیں انجام دے سکتے ہو۔

سوال یہ ہے کہ یہی بات اگر قرآن و سنت کی تشریح کے دقیق اور نازک کام کے لئے کہی جائے تو وہ "اجارہ داری" کیسے بنجاتی ہے؟ کیا قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کرنے کے لئے کوئی اہلیت اور کوئی قابلیت درکار نہیں؟ کیا اس کے لئے کسی درسگاہ میں پڑھنے اور کسی استاذ سے علم حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا پوری دنیا میں ایک قرآن و سنت ہی کا علم ایسا لاوارث رہ گیا ہے کہ اس کے معاملے میں ہر شخص کو اپنی "تشریح و تعبیر" کرنے کا حق حاصل ہے، خواہ اس نے قرآن و سنت کا علم حاصل کرنے کے لئے چند مہینے بھی خرچ نہ کئے ہوں۔

ہمارے تجدد پسند حضرات علماء پر اس غیظ و غضب کا اظہار تو صبح و شام فرماتے ہیں کہ وہ تشریح قرآن و سنت کے

اہل کیوں بن بیٹھے؟ لیکن انہوں نے کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی کہ علماء نے اس اہلیت کو حاصل کرنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلے ہیں؟ کس طرح انگریزوں کے دو صد سالہ اقتدار میں ان کے ظلم و ستم کا ہدف بنکر، اور چونکہ انگریز کی طرف سے ان پر وسائلِ معاش کے تمام دروازے بند کر دئے گئے تھے، اس لئے مال و دولت کی چمک دمک سے منہ موڑ کر روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہنکر، اور اس کے باوجود آپ جیسے حضرات کے طعنے سُنکر یہ علم حاصل کیا ہے؟ کس طرح سالہا سال چراغوں کے سامنے آنکھیں سلگائی ہیں؟ —— جان و مال اور جذبات کی کیسی کیسی قربانیاں دیکر دینی علوم کو زندہ رکھا ہے؟ اور کس طرح اپنی زندگی کو دین کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے؟ —— اس کے بعد اگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کتاب و سنت کی تشریح کا حق دیتے ہیں، اور پوری اُمّتِ اسلامیہ ان کے اس حق پر اعتماد کرتی ہے تو آپ کو اس پر گلہ کیوں ہے؟

کتاب و سنت کی تشریح کے لئے آپ کا اشتیاق بلاشبہ قابلِ تعریف ہے، لیکن اس کے لئے جس دیدہ ریزی کی ضرورت ہے پہلے کچھ اس کا ذائقہ تو چکھئے، زندگی کا کچھ حصّہ علوم کتاب و سنت کے کوچے میں گذاریئے۔ اس کوچے کے آداب سیکھئے، اسکے بعد اگر کوئی شخص آپ کے لئے کتاب و سنت کی تشریح کے حق کا قائل نہ ہو تو بلاشبہ آپ کا گلہ جائز اور برحق ہوگا۔

بحالاتِ موجودہ تو آپ کا مسلک یہ ہے کہ ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟

اور اس کے نتیجے میں آپ کی جو کیفیت ہے اس کے لئے اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا شعر پیش کرنے سے تو گستاخی ہو جائیگی، اقبال کے الفاظ میں اس کی تصویر سن لیجئے ؎

علم غیر آموختی، اندوختی　　روئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش می بری　　من ندانم تو توئی یا دیگری؟
عقلِ تو زنجیریِ افکارِ غیر　　در گلوئے تو نفس از تارِ غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار　　در دلِ تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ　　سرو ہایت را قبا ہا خواستہ
بادہ می گیری بجام از دیگران　　جام ہم گیری بوام از دیگران
آن نگاہش سرِ مازاغ البصر　　سوئے قوم خویش باز آید اگر
لست منی گویدت مولائے ما
وائے ما اے وائے ما اے وائے ما

ان حالات میں یہ قوم جسے مسلمان کہتے ہیں، اور جو ہزار عملی کوتاہیوں کے باوجود نظری طور پر آج بھی مسلمان ہے، قرآن و سنت کی تفسیر و تشریح کو آپ کے حوالے کیسے کر سکتی ہے؟

رہگئی یہ بات جس کا اظہار ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی طرف سے ماہنامہ فکر و نظر نے اس طرح کیا ہے کہ:۔

"اسلام میں اُمّت من الحیث المجموع (؟) قانون سازی کرتی رہی ہے اور اب بھی

اسی کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے"

تو کاش وہ اس کی بھی وضاحت فرما دیتے کہ کیا امت کے من حیث المجموع قانون سازی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ امت کے کروڑوں افراد میں سے ایک ایک فرد قانون سازی کرے، اور ہر ان پڑھ دیہاتی بھی اس کام میں شریک ہو؟ یا امت کو یہ حق حاصل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے میں سے کچھ ایسے باصلاحیت اور معتمد نمائندوں کو منتخب کرنے کا اختیار رکھتی ہے جو قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر کے پوری طرح ...... اہل ہوں، لیکن بالآخر اسے ان منتخب لوگوں کے کام پر ہی اعتماد کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جمہوریت کے کٹر پرستار بھی جمہور کے حق کا یہ احمقانہ مفہوم نہیں سمجھتے کہ جمہور کا ہر ہر فرد ریاستی معاملات کے ہر ہر جزء میں دخل انداز ہو سکتا ہے، بلکہ ان کے نزدیک بھی ہر فن کو اس کے منتخب ماہرین کے سپرد کیا جاتا ہے، پھر جو لوگ اس فن کی واقفیت نہیں رکھتے وہ ان ماہرین پر اعتماد کرتے ہیں، اور اسے کوئی یہ نہیں کہتا کہ جمہور سے ان کا حق چھین لیا گیا ہے۔

جمہور کے حق کے اس تجزیئے کے بعد آپ خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ اس ملک کے دس کروڑ مسلمان قرآن و سنت کی تشریح کے معاملے میں کن لوگوں پر اعتماد کرتے ہیں؟ جب انہیں قرآن و سنت کا کوئی حکم سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ادارہ تحقیقات اسلامی یا کسی اور تجدد پسند ادارے کا رخ کرتے ہیں یا انہی "رجعت پسند" علماء کا جنہوں نے بقول آپ کے جمہور کا حق چھین رکھا ہے؟ اگر جمہور مسلمان کتاب و سنت کے معاملے میں بغیر کسی جبر و اکراہ اور قانونی پابندی کے انہی بوریئے پر بیٹھنے والے علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں، انہی پر اعتماد کرتے ہیں، انہی کی بات پر ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے ــــ اور کون ہے جو اس امر واقعہ کا انکار کر سکے؟ ــــ تو آپ خود ہی غور فرما لیجئے کہ جمہور کا حق کس صورت میں پامال ہوتا ہے؟ ان علماء کو کتاب و سنت کی تشریح کا حق دیکر؟ یا اُن تجدد پسند حضرات کو قرآن و سنت پر مشق ستم کی کھلی چھٹی دیکر جن کی تحریف کے نشتر نے جمہور کے دلوں کو زخمی کیا ہوا ہے؟

آخر میں ان حضرات کو سب سے بڑا اعتراض اس "تقویٰ" کی شرط پر ہے، ان کے نزدیک کتاب و سنت کی تشریح کے لئے "علم" کی طرح "تقویٰ" بھی ضروری نہیں ہونا چاہیئے، اور اس معاملے میں نہ جانے کس "اندیشے" کے پیش نظر ان کے نزدیک سب سے بڑی پیچیدگی یہ ہے کہ :-

> اہل تقویٰ کی شرط ایک ایسی شرط ہے کہ ہر عالم اپنے فتوے کے خلاف دوسرے کی رائے کو اس بناء پر بڑی آسانی سے مسترد کر سکتا ہے، کیونکہ تقویٰ کو جانچنے کا معیار اپنا اپنا ہوتا ہے"۔ (فکر و نظر نومبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۳۲۶)

اس پر ہم اسکے سوا اور کیا عرض کریں کہ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے "انفرادی اندیشوں" سے ذرا بلند ہو کر غور فرمائیں گے تو اس معاملے میں بھی کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہے گی، وہی جمہور جن کو آپ قانون سازی کا حق دلوانا چاہتے ہیں، اس بات کا فیصلہ بھی کرنے کے مجاز ہیں کہ کس شخص میں "تقویٰ" کی یہ شرط پائی جاتی ہے؟ جمہور مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر غلط نہیں ہوتا، اُن کی زبان "نقارۂ خدا" ہے۔ جس شخص کے "تقوی" پر جمہور کو اعتماد ہو، اسے کتاب و سنت کی تشریح کا کام سونپ دینے میں کیا قباحت ہے؟

خوب سمجھ لیجئے کہ تقویٰ کوئی مبہم اور غیر معین صفت نہیں ہے جس کی تعریف ہر شخص اپنے مزاج و مذاق کے مطابق کر سکتا ہو، "تقویٰ" اسلام میں ایک قانونی اصطلاح ہے، اور اس پر بیشمار شرعی احکام کا دار و مدار ہے۔ جب بھی اسکو کسی قانونی مفہوم میں استعمال کیا جائے گا، اس سے مراد مامورات پر عمل، کبائر سے پرہیز اور صغائر پر اصرار سے اجتناب" ہوتا ہے، جو قرآنی اصطلاح کے مطابق "فجور" کی ضد ہے۔ ارشاد ہے:-

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا

لہٰذا جو شخص "فجور" یعنی ظاہری گناہوں سے پرہیز کرتا ہو، وہ اس قانونی اصطلاح کے مطابق "متقی" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کے "تقویٰ" کا فیصلہ کرنے کے لئے جمہور کو کوئی قابل ذکر الجھن پیش نہیں آسکتی ــــــ ان گذارشات کو ذہن میں رکھ کر فرمائیے کہ تشریح کتاب و سنت کے لئے "علم" اور "تقویٰ" کی شرط لگانے میں کیا الجھن اور کیا پیچیدگی ہے؟

آخر میں ہم ایک بار پھر "تجدد پسند" حضرات سے یہ مخلصانہ گذارش کریں گے کہ علمی اور فکری مباحث میں چلتے ہوئے نعرے چھوڑ دیجئے اور خالص پروپیگنڈا کے ہتھیاروں کو استعمال کرنے سے نہ ملک و قوم کی کوئی خدمت انجام دی جاسکتی ہے، نہ اس سے مسائل حل ہوسکتے ہیں اور نہ کسی سنجیدہ ذہن پر اس طرز عمل کا کوئی اچھا اثر مرتب ہوتا ہے، ان نعروں کے نقارخانے میں زیادہ سے زیادہ ایک مختصر عرصے کے لئے آپ حق کی آواز کو گم کر سکتے ہیں، لیکن اس سے صرف کان متاثر ہوتے ہیں، دل نہیں، ایک مرحلہ آتا ہے کہ نعرہ لگانے والوں کی آواز بیٹھ جاتی ہے، ان کے حلق خشک ہو جاتے ہیں۔ اس وقت حق کی باوقار آواز پوری قوت کے ساتھ ابھرتی ہے، براہ راست دلوں کو متاثر کرتی ہے، اور ہمیشہ کیلئے ان میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ!

محمد تقی عثمانی

۲۵ رمضان ۱۳۸۷ھ

مشورہ دیجیے!

۱۔ البلاغ ۲۰×۳۰/۸ پر شائع ہوتا ہے۔ کچھ حضرات اسے ۲۰×۲۶/۸ پر شائع کرنے پر مصر ہیں جو بینات، الحق وغیرہ کا سائز ہے، اس سلسلہ میں بعض محترم بزرگوں کا اصرار تو اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ سائز بدلو تو میں قلمی اعانت پر آمادہ ہوں!

بہر حال ہمیں موجودہ سائز سے نہ کوئی خاص شغف اور لگاؤ۔ اگر کرم فرمایان البلاغ کی یہی رائے اور مشورہ ہوا تو انشاء اللہ سال دوم کا پہلا پرچہ ۲۰×۲۶/۸ پر ہی شائع ہوگا۔ آپ اپنی رائے اور مفید مشوروں سے ذی قعدہ کے نصف تک مطلع فرمادیں۔

۲۔ البلاغ موجودہ معیار پر شائع کرنے میں ہر ماہ جو خسارہ ہم اٹھا رہے ہیں، کاغذ کی روز افزوں ہوشربا گرانی کے سبب اس کو زیادہ دن تک برداشت نہ کیا جاسکے گا، اور بالآخر اس کا کوئی مداوا سوچنا ہی ہوگا۔ فی الوقت ہمارے خیال میں اس کی دو صورتیں ہیں۔

الف۔ معیار یہی رکھا جائے اور سالانہ چندہ آٹھ روپے اور فی پرچہ ۵۰ پیسے قیمت کردی جائے۔

ب۔ کاغذ بجائے سفید کے نیوز پیپر استعمال کیا جائے اور قیمت یہی رکھی جائے!

۳۔ بعض احباب کا خیال ہے کہ رسالہ کو آفسٹ طباعت پر لے آیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ آفسٹ میں خوبصورتی اور خوشنمائی آجاتی ہے لیکن اس صورت میں قیمت میں اضافہ بہر صورت ناگزیر ہوگا! اس پر غور فرماکر اپنے مفید مشوروں سے جلد از جلد مطلع فرمائیں! (نعمانی)

معارف القرآن

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

حجر آیت ۱۶

ستارے اور سیارے کہاں ہیں؟
قدیم و جدید علم ہیئت کے نظریات!
اور
قرآن کریم کے ارشادات!

ولقد جعلنا فی السماء بروجا وزینٰھا للنٰظرین

ترجمہ:۔ اور بلاشبہ ہم نے آسمان میں ستارے بنائے، اور انہیں دیکھنے والوں کیلئے مزین کردیا۔

اللغات بروج برج کی جمع ہے۔ جو بڑے محل اور قلعہ کیلئے بولا جاتا ہے۔ جس میں نگہبان سپاہی رہتے ہیں۔ ائمہ تفسیر مجاہد قتادۃ۔ ابوصالح وغیرہ نے اس جگہ بروج سے مراد۔ بڑے ستارے قرار دیا ہے۔

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیات میں منکرین کی ہٹ دھرمی اور عناد کا ذکر تھا ان آیات میں جو آگے آرہی ہیں۔ اللہ جل شانہ کے وجود توحید۔ علم۔ قدرت کے واضح دلائل۔ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کے حالات ومشاہدات.... بیان کئے گئے ہیں جن میں ذرا بھی غور کیا جائے تو کسی عاقل کو انکار کی مجال نہیں رہتی ارشاد فرمایا اور بیشک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کئے اور دیکھنے والوں کے لئے آسمان کو ستاروں سے آراستہ کیا کہ دیکھنے میں اچھا معلوم ہو۔

احکام ومسائل

جعلنا فی السماء بروجاً کے الفاظ سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بروج	ستارے اور سیارے آسمانوں کے اندر ہیں یا باہر۔ قدیم وجدید علم ہیئت کے نظریات اور قرآن کریم کے ارشادات۔

یعنی ستارے آسمانوں کے اندر ہیں کیونکہ حرف فی ظرفیت کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح سورہ نوح میں ہے۔ الم تروا کیف خلق اللہ سبع سموات طباقا وجعل القمر فیھن نوراً وجعل الشمس سراجا۔ اس میں فیھن کی ضمیر سبع سموات کی طرف راجع ہے جس سے ظاہر آیہی مفہوم ہوتا ہے کہ چاند آسمانوں کے اندر ہے۔ لیکن یہاں دو باتیں قابل غور ہیں اول تو یہ کہ قرآن کریم میں لفظ سماء جس طرح اس عظیم الشان اور وہم وگمان سے زائد

وسعت رکھنے والی مخلوق کے لئے استعمال ہوتا ہے جسمیں قرآن کی تصریحات کے مطابق دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کے پہرے ہیں۔ خاص خاص اوقات میں کھولے جاتے ہیں اور جن کی تعداد قرآن کریم نے سات بتلائی ہے۔ اسی طرح یہ لفظ سماء ہر بلند چیز جو آسمان کی طرف ہو اس پر بھی بولا جاتا ہے۔ آسمان وزمین کے درمیان کی فضاء اور اس سے آگے جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا بولتے ہیں یہ سب دوسرے معنے کے اعتبار سے لفظ سماء کے مفہوم میں داخل ہیں۔ وانزلنا من السماء ماءً طھوراً اور اسی طرح کی دوسری آیتیں جن میں آسمان سے پانی برسانے کا ذکر ہے۔ ان کو اکثر مفسرین نے اسی دوسرے معنی پر محمول فرمایا ہے۔ کیونکہ عام مشاہدات سے بھی یہ ثابت ہے کہ بارش ان بادلوں سے برستی ہے

جو آسمان کی بلندی سے کوئی نسبت نہیں رکھتے اور خود قرآن کریم نے بھی دوسری آیات میں بادلوں سے پانی برسانے کی تصریح فرمائی ہے۔ ارشاد ہے ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون اس میں مزن مزنۃ کی جمع ہے جس کے معنی سفید بادل کے آتے ہیں معنی یہ ہیں کہ کیا بارش کو سفید بادلوں سے تم نے اوتارا ہے یا ہم نے دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وانزلنا من المعصرات ماءً ثجاجا۔ اس میں معصرات کے معنی پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہم نے ہی پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا۔ قرآن مجید کی ان واضح تصریحات اور عام مشاہدات کی بناء پر جن آیات قرآن میں بارش کا آسمان سے برسانا مذکور ہے اونمیں بھی اکثر مفسرین نے لفظ سماء کے یہی دوسرے معنی لئے ہیں یعنی فضاء آسمانی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن کریم اور لغت کی تصریحات کے مطابق لفظ سماء فضائے آسمانی کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اور خود جرم آسمان کے لئے بھی۔ تو ایسی صورت میں جن آیات میں کواکب اور سیارات کے لئے فی السماء کا لفظ استعمال ہوا ہے اون کے مفہوم میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ یہ کواکب اور ستارے جرم آسمان کے اندر ہوں۔ یا فضائے آسمانی میں آسمانوں کے نیچے ہوں۔ اور دو احتمالوں کے ہوتے ہوئے کوئی قطعی فیصلہ قرآن کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن نے ستاروں اور سیاروں کو آسمان کے اندر قرار دیا ہے یا اون سے باہر فضائے آسمانی میں۔ بلکہ الفاظ قرآن کے اعتبار سے دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ کائنات کی تحقیقات اور تجربے اور مشاہدے سے جو صورت بھی ثابت ہو جائے قرآن کی کوئی تصریح اوس کے منافی نہیں ہے۔

حقائق کونیہ اور قرآن

یہاں ایک بات اصولی طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی فلسفہ یا ہیئت کی کتاب نہیں جس کا موضوع بحث حقائق کائنات یا آسمانوں اور ستاروں کی ہیئت و حرکات وغیرہ کا بیان ہو مگر اس کے ساتھ ہی وہ آسمان و زمین اور اون کے درمیان کی کائنات کا ذکر بار بار کرتا ہے۔ اون میں غور و فکر کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔ قرآن کریم کی ان تمام آیات میں غور کرنے سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز ان حقائق کونیہ کے متعلق انسان کو صرف وہ چیزیں بتلانا چاہتا ہے جن کا تعلق اس کے عقیدے اور نظریہ کی درستی سے ہو یا اس کے دینی اور دنیوی منافع اون سے متعلق ہوں۔ مثلاً قرآن کریم نے آسمان و زمین اور ستاروں، سیاروں کا اور اون کی حرکات اور حرکات سے پیدا ہونے والے آثار کا ذکر بار بار ایک تو اس مقصد سے کیا ہے کہ انسان انکی عجیب و غریب صنعت اور مافوق العادت آثار کو دیکھ کر یہ یقین کرے کہ یہ چیزیں خود بخود پیدا نہیں ہو گئیں ان کو پیدا کرنے والا کوئی سب سے بڑا حکیم سب سے بڑا علیم اور سب سے بڑا صاحب قدرت و قوت ہے۔ اور اس یقین کے لئے ہرگز اس کی ضرورت نہیں کہ آسمانوں اور فضائی مخلوقات اور ستاروں سیاروں کے مادے کی حقیقت اور اونکی اصلی ہیئت و صورت اور اون کے پورے نظام کی پوری کیفیت اس کو معلوم ہو بلکہ اس کے لئے صرف اتنا بھی کافی ہے۔ جو ہر شخص مشاہدہ سے دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ شمس و قمر۔ اور دوسرے ستاروں کے کبھی سامنے آنے اور کبھی غائب ہو جانے سے نیز چاند کے گھٹنے بڑھنے سے اور رات دن کے انقلاب پھر مختلف موسموں اور مختلف خطوں میں دن رات کے گھٹنے بڑھنے کے عجیب و غریب نظام سے جس میں ہزاروں سال سے کبھی ایک منٹ ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا ان سب امور سے ایک ادنیٰ عقل و بصیرت رکھنے والا انسان یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکیمانہ نظام یوں ہی خود بخود نہیں چل رہا کوئی اسکو چلانے بنانے والا۔ باقی رکھنے والا ہے۔ اور اتنا سمجھنے

کے لئے انسان کو نہ کسی فلسفی تحقیق اور آلات رصدیہ وغیرہ کی حاجت پڑتی ہے نہ قرآن نے اس کی طرف دعوت دی۔ قرآن کی دعوت صرف اوسی حد تک۔ ان چیزوں میں غور وفکر کی ہے جو عام مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے آلات رصدیہ بنانے یا مہیا کرنے اور اجرام سماویہ کی ہیئتیں دریافت کرنے کا مطلقاً کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر ان آیات کونیہ پر تدبر اور غور وفکر کا یہ مطلب ہوتا کہ انکی حقائق اور ہیئیات اور ان کی حرکات کا فلسفہ معلوم کیا جائے تو یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اہتمام نہ فرماتے۔

خصوصاً جبکہ ان فنون کا رواج اور تعلیم وتعلم دنیا میں اوس وقت موجود بھی تھا۔ مصر، شام، عرب، ہند، چین، وغیرہ میں ان فنون کے جاننے والے اور ان پر کام کرنے والے موجود تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانسو سال پہلے فیثاغورس کا اور اوس کے کچھ بعد بطلیموس کا نظریہ دنیا میں شائع اور رائج ہو چکا تھا۔ اور اوس زمانے کے حالات کے مناسب آلات رصدیہ وغیرہ ایجاد بھی ہو چکے تھے۔ مگر جس ذات قدسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور جن صحابہ کرام نے بلا واسطہ آپ سے اون کو پڑھا اونہوں نے کبھی اس طرف التفات نہیں فرمایا۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ ان آیات کونیہ میں تدبر اور غور وفکر کا وہ منشا ہرگز نہ تھا جو آجکل کے بعض تجدد پسند علماء نے یورپ اور اس کے معاملات سے متاثر ہو کر اختیار کیا ہے کہ یہ خلائی سفر۔ چاند اور مریخ وزہرہ پر کمندیں پھینکنے کی مساعی قرآن کریم کے تقاضے کو پورا کرنا ہے۔

بس صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کریم نہ ان فلسفی اور سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے نہ اون سے بحث کرتا ہے اور نہ اون کی مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کا حکیمانہ اصول واسلوب کائنات ومخلوقات سے متعلقہ تمام فنون کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ہر فن کی چیزوں سے صرف اوسی قدر لیتا اور بیان کرتا ہے جس قدر انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت سے متعلق ہے اور جس کو انسان آسانی سے حاصل بھی کر سکتا ہے، اور جن کے حصول پر تخمیناً اوس کو اطمینان بھی ہو سکتا ہے۔ فلسفیانہ دور از کار بحثوں سے اور ایسی تحقیقات سے جو عام انسانوں کے قابو سے باہر ہیں اور جن کو کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہی صحیح ہیں بلکہ حیرانی اور شکوک بڑھتے ہیں۔ ایسی بحثوں میں انسان کو نہیں الجھاتا۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں انسان کی منزل مقصود ان تمام زمینی اور آسمانی کائنات ومخلوقات سے آگے اپنے خالق کی مرضیات پر چل کر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو حاصل کرنا ہے۔ حقائق کائنات کی بحث نہ اس کے لئے ضروری ہے اور نہ اس پر پورا عبور انسان کے بس میں ہے ہر زمانے کے فلاسفروں اور ماہرین فلکیات کے نظریات میں شدید اختلافات اور روزمرہ کے نئے انکشافات اسکی واضح دلیل ہیں کہ کسی نظریہ اور تحقیق کو یقینی اور آخری نہیں کہا جا سکتا۔ انسانی ضرورت سے متعلقہ تمام فنون فلکیات۔ کائنات فضاء ابر وباران۔ خلا۔ طبقات الارض پھر زمین پر پیدا ہونے والی مخلوقات جمادات۔ نباتات حیوانات سے اور عالم انسان، اور انسانی علوم وفنون تجارت۔ زراعت۔ صنعت وغیرہ ان سب میں قرآن حکیم صرف اون کی روح اور ہدایتی حصے کو اس قدر لیتا ہے جس سے انسان کی دینی یا دنیوی ضرورت متعلق ہے دور از کار تحقیقات کی دلدل میں انسان کو نہیں پھنساتا البتہ کہیں کہیں کسی خاص مسئلے کی طرف اشارہ یا صراحت پائی جاتی ہے۔

تفسیر قرآن میں فلسفی نظریات کی موافقت یا مخالفت کا صحیح معیار

علماء اہل حق قدیم وجدید اس پر متفق ہیں کہ ان مسائل

کے متعلق جو بات قرآن کریم سے یقینی طور پر ثابت ہے۔ اگر کوئی قدیم یا جدید نظریہ اوس سے مختلف ہو تو اوس کی وجہ سے قرآنی آیات میں کھینچ تان اور تاویل جائز نہیں اوس نظریہ ہی کو مغالطہ قرار دیا جائے گا۔ البتہ جن مسائل میں قرآن کریم کی کوئی تصریح موجود نہیں۔ الفاظ قرآنی میں دونوں معنے کی گنجائش ہے۔ وہاں اگر مشاہدات اور تجربے سے کسی ایک نظریہ کو قوت حاصل ہو جائے تو آیت قرآنی کو بھی اوسی معنی پر محمول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جیسے اسی آیت جعلنا فی السماء بروجا میں ہے کہ قرآن کریم نے اس بارے میں کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا کہ ستارے آسمان کے اندر ہیں یا باہر فضائے آسمانی میں ہیں آجکل جبکہ خلائی تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان سیارات ..... تک پہونچا جا سکتا ہے تو اس سے فیثاغورثی نظریہ کی تائید ہو گئی کہ ستارے آسمانوں میں پیوست نہیں کیونکہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ صریحہ کی تصریحات کی رو سے آسمان ایک ایسا حصار ہے جس میں دروازے ہیں اور دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے۔ اون میں ہر شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ اس مشاہدے اور تجربے کی بناء پر آیتِ مذکورہ کا یہ مفہوم قرار دیا جائے گا کہ کواکب کو فضائے آسمانی میں پیدا کیا گیا ہے اور یہ کوئی تاویل نہیں بلکہ دو مفہوم میں سے ایک کی تعیین ہے۔

لیکن اگر کوئی سرے سے آسمانوں کے وجود ہی کا انکار کرے جیسے ہیئت جدید والے کہتے ہیں یا کوئی یہ دعوے کرے کہ راکٹوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ آسمانوں کے اندر داخلہ ہو سکتا ہے تو از روئے قرآن اوس دعوی کو غلط قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ قرآن کریم نے متعدد آیات میں یہ بات واضح طور پر بتلائی ہے کہ آسمانوں میں دروازے ہیں تو وہ دروازے خاص خاص حالات میں کھولے جاتے ہیں۔ ان دروازوں پر فرشتوں کا پہرہ مسلط ہے۔ آسمانوں میں داخلہ ہر شخص کا [illegible] نہیں ہو سکتا۔ اس دعوے کی وجہ سے اون آیات میں کوئی تاویل نہیں کیجائے گی۔ اس دعوی کو غلط قرار دیا جائے گا۔

اسی طرح جبکہ قرآن کریم کی آیت کل فی فلک یسبحون سے ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے تو اس معاملہ میں بطلیموسی نظریہ کو غلط قرار دیا جائے گا۔ جس کی رو سے ستارے آسمان کے جرم میں پیوست ہیں۔ وہ خود حرکت نہیں کرتے بلکہ آسمان کی حرکت کے تابع انکی حرکت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قدیم مفسرین میں سے بعض نے جو فلکیات کے متعلق بطلیموسی نظریہ کے معتقد تھے۔ اونہوں نے اون آیات قرآنی میں تاویلات سے کام لیا جس سے بطلیموسی نظریہ کے خلاف کوئی چیز سمجھی جاتی تھی۔ اسی طرح آج کے بعض مصنفین جن آیات کو جدید ہیئت کے نظریات سے مختلف سمجھتے ہیں اون میں تاویلات کر کے اس کے مطابق بنانے کی فکر کرتے ہیں یہ دونوں صورتیں درست نہیں۔ سلف صالح کے طریقے کے خلاف قابل تردید ہیں۔

البتہ واقعہ یہی ہے کہ اس وقت تک ہیئت جدید نے جو نئی تحقیقات پیش کی ہیں اون میں آسمانوں کے انکار کے سوا کوئی بھی قرآن و سنت کے خلاف نہیں۔ بعض لوگ اپنے قصور علم سے اون کو قرآن یا سنت کے خلاف سمجھ کر ...... تاویلات کے درپے ہوتے ہیں۔

زمانہ حال کے سب سے بڑے مفسر قرآن سید محمود آلوسی بغدادی جن کی تفسیر روح المعانی علماء سلف کی تفاسیر کا بہترین خلاصہ و عرب و عجم مشرق و مغرب میں مقبول و مستند تفسیر ہے۔ موصوف جس طرح قرآن و سنت کے متبحر عالم ہیں اسی طرح فلسفہ و ہیئت قدیم و جدید کے بھی بڑے عالم ہیں اونہوں نے اپنی تفسیر میں تحقیقات فلسفیہ کے متعلق یہی اصول قرار دیا ہے۔ جو اوپر ذکر کیا گیا ہے اور انکے پوتے علامہ سید محمود شکری آلوسی نے ان مسائل پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ ما دل علیہ القرآن مما یعضد

الهيئة الجديدة القويمة البرهان۔ جس میں ہیئت جدیدہ کے نظریات کی تائید قرآن کریم کی روشنی میں کی گئی ہے مگر دوسرے تجدد پسند علماء کی طرح قرآنی آیات میں کسی قسم کی تاویل کو روا نہیں رکھا۔ اون کے چند جملے اس جگہ نقل کر دینا کافی ہے۔ جو ہیئت جدیدہ کی تائید میں لکھے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

رأيت كثيرا من قواعدها لا يعارض النصوص الواردة في الكتاب والسنة على انها لو خالفت شيئا من ذلك لم يلتفت اليها ولم نؤول النصوص لاجلها والتاويل فيها ليس من مذاهب السلف الحرية بالقبول بل لابد ان نقول ان المخالف لها مشتمل على خلل فيه فان العقل الصريح لا يخالف النقل الصحيح بل كل منهما يصدق الآخر ويؤيده۔

(ما دل عليه القرآن)

میں نے ہیئت جدیدہ کے بہت سے قواعد کو دیکھا ہے۔ وہ قرآن وسنت کی نصوص کے خلاف نہیں۔ اور اس کے باوجود اگر وہ قرآن وسنت کی کسی نص کے خلاف ہو تو ہم اوس کی طرف رُخ نہ کریں گے۔ اور قرآن وسنت کی نصوص میں اوس کی وجہ سے تاویل نہ کریں گے کیونکہ ایسی تاویل سلف صالحین کے مذہب مقبول میں نہیں ہے بلکہ ہم اوس وقت یہ کہیں گے کہ جو نظریہ قرآن وسنت کے خلاف ہے اوسمیں ہی کوئی خلل ہے۔ کیونکہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب

اسلامی ذبیحہ

(۳)

قرآن کریم نے متعدد آیات میں ذبیحہ پر اللہ کا نام لینے پر شرط ضروری بتلا کر یہ واضح کر دیا کہ جانور کا ذبیحہ عام پینے پینے اور برتنے کی چیزوں کی طرح نہیں بلکہ اوس کی ایک شرعی اور مذہبی حیثیت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کا ذبیحہ حلال نہو کیونکہ وہ اس اسلامی پابندی پر ایمان ہی نہیں رکھتا کہ اللہ کے نام سے جانور حلال ہوتا ہے۔ اس کے بغیر مُردار ہو جاتا ہے۔

لیکن سورہ مائدہ کی آیت مذکورہ نے اس میں سے کفار اہل کتاب کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں۔

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم والمحصنات من المؤمنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم (مائدہ ۵)

آج حلال ہوئی تمکو سب ستھری چیزیں اور اہل کتاب کا کھانا تمکو حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے اور حلال ہیں تمکو پاکدامن عورتیں مسلمان اور پاکدامن عورتیں اون میں سے جن کو دیگئی کتاب تم سے پہلے۔

سورہ مائدہ کی تیسری آیت میں مذکور تھا الیوم اکملت لکم دینکم یعنی ہم نے آج تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر مکمل کر دی اس پانچویں آیت میں الیوم کے لفظ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ جو طیبات تم پر اب حلال رکھی گئی ہیں وہ ہمیشہ کے لئے حلال ہیں اب کسی نسخ کا احتمال نہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ اس آیت میں اول تو مسلمانوں کے لئے طیبات یعنی پاکیزہ چیزوں کے حلال کرنے کا ذکر فرمایا اس کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ کفار خواہ مشرکین ہوں یا اہل کتاب کسی کا مارا ہوا جانور مسلمانوں کے لئے حلال نہو کیونکہ وہ بظاہر طیبات میں داخل نہیں مگر اس کے بعد وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم فرما کر اہل کتاب کے ذبیحہ کو بطور استثناء مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیدیا گیا۔ اسی طرح اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان مرد کے نکاح کی بھی اجازت آیت کے آخر میں دیدی گئی۔ اسکی تفصیلی بحث تو آگے آ رہی ہے۔

یہاں ایک جملہ اور قابل غور ہے۔ طعامکم حل لھم یعنی مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال ہے۔ اس میں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں کا کھانا تو سبھی کے لئے حلال ہے۔ مشرکین کے لئے بھی ممنوع نہیں۔ پھر اس جگہ اہل کتاب کے لئے خاص کر کے کیوں ذکر کیا گیا؟

علماء تفسیر نے اسکی کئی وجوہ بیان فرمائی ہیں اون میں سے زیادہ اقرب وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس آیت نے اہل کتاب کے ساتھ دو معاملوں کی اجازت دی ہے۔ ایک اون کے ذبائح کھانے کی اجازت۔ دوسرے اون کی عورتوں سے نکاح کا جواز۔

اس جگہ اہل کتاب کی تخصیص سے مقصود ان دونوں معاملوں میں ایک خاص فرق کا اظہار ہے۔ وہ یہ کہ طعام و ذبائح کا معاملہ تو دونوں طرف سے جائز ہے۔ اہل کتاب کے ذبائح مسلمانوں کیلئے

اور مسلمانوں کے اہل کتاب کے لئے جائز ہیں مگر نکاح کا معاملہ ایسا نہیں اس میں جواز صرف یک طرفہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ مگر مسلمان عورت کے لئے اہل کتاب مرد سے نکاح جائز نہیں۔ اس لئے طعام کے مسئلے کو دو طرفہ جواز کی صورت میں بیان کردیا۔ اس کے بعد نکاح کے مسئلے میں صرف نساء اہل کتاب کی اجازت مسلمانوں کے لئے مخصوص کر کے بتلادی۔ جس سے معلوم ہوگیا کہ مسلمان عورت کا نکاح اہل کتاب مرد سے جائز نہیں۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

یہ آیت مذکورہ کے الفاظ کی مختصر تشریح و تفسیر تھی۔ اب مسئلہ زیر بحث کا تجزیہ کیا جائے تو چار سوال قابل غور ہیں۔

(۱) اول یہ کہ اہل کتاب سے کون لوگ مراد ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ تمام کفار میں سے طعام اہل کتاب کو حلال قرار دینے کی حکمت کیا ہے۔

(۴) چوتھے یہ کہ طعام اہل کتاب سے اون کا ہر کھانا بلا کسی قید و شرط کے مطلقاً مراد ہے کہ وہ جو کچھ کھاتے ہیں وہ سب مسلمانوں کے لئے حلال کردیا گیا یا صرف وہی کھانا مراد ہے جو اسلامی اصول کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے حلال ہے۔

پہلے سوال کا جواب گذشتہ تحریر میں بحوالہ تفسیر قرطبی صفحہ ۲۶ جلد ۲ حضرت عبداللہ ابن عباس کے بیان سے یہ آچکا ہے کہ اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور تفسیر بحر محیط میں ہے۔

وظاہر قولہ اوتوا الکتاب انہ مختص بنی اسرائیل والنصاریٰ الذی نزل علیھم التوراۃ والانجیل (صفحہ ۴۳۱ ج ۳)

قرآن کے الفاظ الذین اوتوا الکتاب سے ظاہر یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیل اور نصاریٰ کیساتھ مخصوص ہے جن پر تورات و انجیل نازل ہوئی ہے۔

اور خود قرآنی تصریحات سے یہ بھی ثابت ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں جو یہود و نصاریٰ موجود تھے اور جن کے کھانے اور عورتوں کی حلت کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یہ وہی یہود و نصاریٰ ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے یہ بھی تصریح فرمادی ہے کہ یہ لوگ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کیا کرتے تھے۔ اور یہ کہ اونہوں نے حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام کو خدا تعالیٰ کا شریک اور معبود بنا رکھا تھا اور اسی لئے قرآن کریم نے اون کو کافر قرار دیا ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح بن مریم

کافر ہوگئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ طعام اہل کتاب جس کے حلال ہونے کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اون اہل کتاب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اصل تورات و انجیل پر عمل کرتے ہوں بلکہ وہ سب یہود و نصاریٰ اس میں داخل ہیں جو اصلی تورات و انجیل میں تحریف کر کے شرک میں مبتلا ہوگئے تھے اور تورات و انجیل کے بہت سے احکام کو بھی بدل ڈالا تھا۔ تفسیر ابن جریر۔ ابن کثیر۔ بحر محیط وغیرہ میں تمام صحابہ و تابعین اور جمہور امت کا یہی مسلک نقل کیا گیا۔

صرف نام کے یہودی نصرانی بحقیقت دہریے اس میں داخل نہیں۔

آجکل یوروپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے۔ جو اپنی مردم شماری کے اعتبار سے یہودی یا نصرانی کہلاتے ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود کے اور کسی مذہب ہی کے قائل نہیں۔ نہ تورات و انجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں نہ موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کو اللہ کا نبی و پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ محض مردم شماری کے نام کی وجہ سے اہل کتاب

کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے۔ نصاریٰ کے بارہ میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ان کا ذبیحہ حلال نہیں اوسکی وجہ یہی بتلائی ہے کہ یہ لوگ دین نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کسی چیز کے قائل نہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد یہ ہے۔

روی ابن الجوزی بسندہ عن علی رض قال لا تاکلوا من ذبائح نصاری بنی تغلب فانہم لم یتمسکوا من النصرانیۃ بشیٔ الا شرب الخمر ورواہ الشافعی بسند صحیح عنہ

(تفسیر مظہری ص۳۲ ج ۳ مائدہ)

ابن جوزی نے سند کیساتھ حضرت علی رض کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نصاریٰ بنی تغلب کے ذبائح کو نہ کھاؤ کیونکہ اونہوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے سوا کچھ نہیں لیا۔ امام شافعی رح نے بھی سند صحیح کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بنی تغلب کے متعلق یہی معلومات تھیں کہ وہ بے دین ہیں نصرانی نہیں ہیں اگرچہ نصرانی کہلاتے ہیں اس لئے ان کے ذبیحہ سے منع فرمایا۔

جمہور صحابہ و تابعین کی تحقیق یہ تھی کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں بالکل دین کے منکر نہیں۔ اس لئے اونھوں نے انکا ذبیحہ بھی حلال قرار دیا۔

وقال جمہور الامۃ ان ذبیحۃ کل نصرانی حلال سواء کان من بنی تغلب او غیرہم وکذلک الیہودی۔

(تفسیر قرطبی ص۷۸ ج ۶)

اور جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے خواہ بنی تغلب میں سے ہو یا اون کے سوا کسی دوسرے قبیلہ اور جماعت سے ہوں اسی طرح ہر یہودی کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ و عیسیٰ کو اللہ کا نبی ہی نہیں مانتے وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے۔

طعام کے لغوی معنی کھانے کی چیز کے ہیں جس میں از روے لغت عربی ہر قسم کی کھانے کی چیزیں داخل ہیں۔ لیکن جمہور امت کے نزدیک اس جگہ طعام سے مراد صرف اہل کتاب کی ذبائح کا گوشت ہے۔ کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیاء خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں۔ کھانے پینے کی خشک چیزیں گیہوں، چنا، چاول اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا مسلمانوں کے لئے حلال و جائز ہے اسمیں کسی کا کوئی خلاف نہیں اور جس کھانے میں انسانی صنعت کو دخل ہے۔ جیسے پکی ہوئی روٹی۔ ترکاری وغیرہ۔ اس میں چونکہ کفار کے برتنوں اور ہاتھوں کی طہارت کا کوئی بھروسہ نہیں اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ اوس سے اجتناب کیا جائے۔ بلا ضرورت شدیدہ استعمال نہ کریں۔ مگر اسمیں جو حال مشرکین بت پرستوں کا ہے وہی اہل کتاب کا بھی ہے کہ نجاست کا احتمال دونوں میں برابر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق شرعاً ہو سکتا ہے وہ صرف اون کے ذبائح کے گوشت میں ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں باتفاق امت طعام اہل کتاب سے مراد اون کے ذبائح ہیں۔ امام تفسیر قرطبی نے لکھا ہے۔

والطعام اسم لما یوکل والذبائح منہ وھو ھھنا خاص بالذبائح عند کثیر من اھل العلم بالتاویل واما ما حرم من طعامہم فلیس بداخل فی عموم الخطاب۔

(قرطبی ص۷۶ ج ۶)

لفظ طعام ہر کھانے کی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس میں ذبائح بھی داخل ہیں اور اس آیت میں طعام کا لفظ خاص ذبائح کے لئے استعمال کیا گیا

اکثر علماء تفسیر کے نزدیک اور اہل کتاب کے
طعام میں سے جو چیزیں مسلمانوں کے لئے حرام ہیں
وہ اس عموم خطاب میں داخل نہیں۔

اس کے بعد امام قرطبی رح نے اس کی مزید تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے:-

لاخلاف بین العلماء ان مالا یحتاج الی ذکاۃ کالطعام الذی لا محاولۃ فیہ کالفاکھۃ والبر جائز اکلہ اذلا یضر فیہ تملک احد والطعام الذی تقع فیہ المحاولۃ علی ضربین احدھما مافیہ محاولۃ صنعۃ لا تعلق لھا بالدین کخبزہ الدقیق وعصرہ الزیت ونحوہ فھذا ان تجنب من الذمی فعلی وجہ التقزز والضرب الثانی التذکیۃ اللتی ذکرنا انھا ھی اللتی تحتاج الی الدین والنیۃ فلما کان القیاس ان لا تجوز ذبائحھم کما نقول انہ لا صلاۃ لھم ولا عبادۃ مقبولۃ رخص اللہ تعالی فی ذبائحھم علی ھذہ الأمۃ واخرجھا النص عن القیاس علی ما ذکرنا من قول ابن عباسؓ

(قرطبی سورہ مائدہ ص ج ۶)

علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ
وہ چیزیں جن میں ذکاۃ کی ضرورت نہیں ہوتی،
مثلاً وہ کھانا جس میں کوئی تصرف نہیں کرنا پڑتا،
جیسے میوہ، اور گندم وغیرہ، اس کا کھانا جائز
ہے، اس لئے کہ اس میں کسی کا مالک بنا چنداں
مضر نہیں ہے، البتہ وہ کھانا جس میں انسان کو
کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک
وہ جس میں کوئی ایسا کام کرنا پڑے جس کا دین سے
کوئی تعلق نہ ہو۔ مثلاً آٹے سے روٹی بنانا، اور
زیتون سے تیل نچوڑنا وغیرہ، کافر ذمی کی ایسی
چیزوں سے اگر کوئی بچنا چاہے تو وہ محض طبعی
کراہت کی بناء پر ہوگا۔ اور دوسری قسم وہ
ہے جس میں عمل ذکاۃ کرنا پڑتا ہے جس کیلئے
دین اور نیت کی ضرورت ہے، تو اگرچہ
قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کافر کی نماز اور
عبادتوں کی طرح اس کا عمل ذکاۃ بھی
قبول نہ ہونا چاہیئے تھا، لیکن اللہ نے اس
امت کے لئے خاص طور پر ان کے ذبائح حلال
کر دیئے، اور حضرت ابن عباس رضؓ کی نص نے
اس مسئلے کو خلاف قیاس ثابت کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طعام اہل کتاب سے مراد اس آیت میں بالاتفاق علماء تفسیر وہ طعام ہے جس کی حلت مذہب اور عقیدہ پر موقوف ہے۔ یعنی ذبیحہ اسی لئے اس طعام میں اہل کتاب کی ساتھ امتیازی معاملہ کیا گیا کیونکہ وہ بھی اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان کے مدعی ہیں اگرچہ اون کی تحریفات نے ان کے دعوی کو مجروح کر دیا یہاں تک کہ شرک وکفر میں مبتلا ہو گئے۔ بخلاف بت پرست مشرکین کے کہ وہ کسی آسمانی کتاب یا نبی و رسول پر ایمان لانے کا دعوی بھی نہیں رکھتے اور جن کتابوں یا شخصیتوں پر اون کا ایمان ہے۔ وہ نہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتابیں نہ اون کا رسول ونبی ہونا اللہ کے کسی کلام سے ثابت ہے۔

اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہونیکی حکمت اور وجہ۔

زیر بحث مسئلے کا یہ تیسرا سوال ہے اس کا جواب اکثر صحابہ وتابعین اور ائمہ تفسیر کی طرف سے یہ ہے کہ تمام کفار میں سے اہل کتاب یہود ونصاری کے ذبیحہ اور اون کی عورتوں سے نکاح کو حلال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دین میں سیکڑوں تحریفات کے باوجود ان دو مسئلوں میں اون کا مذہب بھی اسلام کے بالکل مطابق ہے یعنی وہ بھی ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا عقیدۃً ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر جانور کو مردار (میتۃ) اور ناپاک وحرام قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح مسئلہ نکاح میں جن عورتوں سے اسلام میں نکاح حرام ہے ان کے مذہب میں بھی حرام ہے۔ اور جس

طرح اسلام میں نکاح کا اعلان اور گواہوں کے سامنے ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ان کے موجودہ مذہب میں بھی یہی احکام ہیں۔
امام تفسیر ابن کثیر نے بھی قول اکثر صحابہ و تابعین کا نقل فرمایا ہے اون کی عبارت یہ ہے۔

(وطعام اهل الكتاب) قال ابن عباس وابو امامة ومجاهد وسعيد بن جبير وعكرمة وعطاء والحسن ومكحول وابراهيم النخعي والسدي ومقاتل بن حيان يعني ذبائحهم وهذا لم يجمع عليه بين العلماء ان ذبائحهم حلال للمسلمين لانهم يعتقدون تحريم الذبح لغير الله ولا يذكرون على ذبائحهم الا اسم الله وان اعتقدوا فيه تعالى ما هو منزه عنه تعالى وتقدس۔

(ابن کثیر سورہ مائدہ صفحہ ۱۹ ج ۳)

ابن عباسؓ، ابوامامہؓ، مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ، حسنؒ، مکحولؒ، ابراہیم نخعیؒ، سدیؒ اور مقاتل بن حیانؒ نے طعام اہل الکتاب کی تفسیر ان کے ذبائح کے ساتھ کی ہے، اور یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے یہاں اجماعی ہے کہ ان کے ذبیحے مسلمانوں کے لئے حلال ہیں، کیونکہ وہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کو حرام سمجھتے ہیں، اور اپنے ذبیحوں پر خدا کے سوا کسی اور کا نام نہیں لیتے، اگرچہ وہ اللہ کے بارے میں ایسی باتوں کے معتقد ہوں جن سے باری تعالیٰ بری پاک اور بلند و بالا ہے۔

ابن کثیر کے اس بیان میں ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام مذکورالصدر حضرات صحابہ و تابعین کے نزدیک طعام اہل کتاب سے اون کی ذبائح مراد ہیں اور اون کے حلال ہونے پر امت کا اجماع ہے جس کی تفصیل دوسرے سوال کے جواب میں بھی گذر چکی ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان سب حضرات کے نزدیک

ذبائح اہل کتاب کے حلال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے مذہب میں بہت سی تحریفات کے باوجود ذبیحہ کا مسئلہ اسلامی شریعت کے مطابق باقی ہے کہ غیر اللہ کا نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو وہ بھی حرام کہتے ہیں اور ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں وہ تثلیث کے مشرکانہ عقیدہ کے قائل ہو گئے۔ اور اللہ اور مسیح بن مریم کو ایک ہی کہنے لگے۔ جس کا قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ هو المسیح بن مریم
بے شک کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہی ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ ذبیحہ کے متعلق تمام قرآنی آیات جو سورہ بقرہ اور سورہ انعام میں آئی ہیں جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے جانور کو بھی اور اوس جانور کو بھی جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ حرام قرار دیا ہے۔ یہ سب آیتیں اپنی جگہ پر محکم اور معمول بہا ہیں۔ سورہ مائدہ کی آیت جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے وہ بھی ان آیات کے حکم سے مختلف نہیں۔ کیونکہ طعام اہل کتاب کو حلال قرار دینے کی وجہ ہی یہ ہے اون کے موجودہ مذہب میں بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور اور وہ جانور جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا حرام ہے۔ موجودہ زمانے میں تورات و انجیل کے جو نسخے اب موجود ہیں اون میں بھی ذبیحہ اور نکاح کے احکام تقریباً وہی ہیں جو قرآن اور اسلام میں ہیں جن کی تفصیل عنقریب ذکر کی جائے گی۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض جاہل عوام اپنے مذہب کے اس حکم کے خلاف کچھ عمل کرتے ہوں جیسا کہ خود مسلمانوں کے جاہل عوام میں بھی بہت سی جاہلانہ رسمیں شامل ہو گئی ہیں۔ مگر اونکو مذہب اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ نصاریٰ کے جاہل عوام کے طرز عمل کو دیکھ کر ہی بعض حضرات تابعین نے یہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ

نے طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اپنے ذبائح کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں کوئی اوس پر مسیح یا عزیر کا نام لیتا ہے کوئی بغیر تسمیہ کے ذبح کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ آیتِ مائدہ جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے اس آیت نے ذبائح اہل کتاب کے حق میں سورہ بقرہ اور انعام کی اون آیتوں میں تخصیص یا ایک قسم کا نسخ کر دیا ہے جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کو یا بغیر اللہ کے نام کے ذبح کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔

بعض اکابر علماء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات تابعین نے اہل کتاب کے متروک التسمیہ ذبیحہ اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو حلال فرمایا ہے اون کے نزدیک بھی اہل کتاب کا اصل مذہب تو اسلامی احکام سے مختلف نہیں ہے، مگر اون کے جاہل عوام یہ غلطیاں کرتے ہیں مگر اس کے باوجود ان حضرات نے جاہل اہل کتاب کو بھی عام اصل کتاب کے حکم سے الگ نہیں کیا اور ذبیحہ اور نکاح کے معاملے میں ان کا بھی وہ حکم رکھا جو ان کے آباؤ اجداد اور اصل مذہب کے پیروؤں کا ہے کہ ان کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

ابن عربی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ میں نے اپنے استاد ابو الفتح مقدسی سے سوال کیا کہ موجودہ نصاریٰ تو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں مثلاً مسیح یا عزیز کا نام بوقت ذبح لیتے ہیں تو ان کا ذبیحہ کیسے حلال ہو سکتا ہے اس پر ابو الفتح مقدسی نے فرمایا۔

ھم من آبائھم وقد جعلھم اللہ تعالیٰ تبعاً لمن کان قبلھم مع علمہ بحالھم (احکام ابن عربی صد ۲۲۹ ج اول)

ان کا حکم اپنے آباؤ و اجداد کا سا ہے۔ (آج کے اہل کتاب کا) یہ حال اللہ کو معلوم تھا، لیکن اللہ نے ان کو انکے آباؤ کے تابع بنا دیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اسلاف امت میں جن حضرات علماء نے اہل کتاب کے ایسے ذبائح کی اجازت دیدی ہے جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا بلکہ غیر اللہ کا لیا گیا ان کے نزدیک بھی اصل مذہب اہل کتاب کا یہی ہے کہ یہ چیزیں اون کے مذہب میں بھی حرام ہیں۔ مگر ان حضرات نے غلط کار عوام کو بھی اوسی حکم میں شامل رکھا جو اصل اہل کتاب کا حکم ہے۔ اس لئے ان کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیدیا۔

اور جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین نے اس پر نظر فرمائی کہ اہل کتاب کے جاہل عوام جو غیر اللہ کے نام یا بغیر کسی نام کے ذبح کرتے ہیں۔ یہ اسلامی حکم کے تو خلاف ہے ہی خود نصاریٰ کے موجودہ مذہب کے بھی خلاف ہے اس لئے ان کے عمل کا احکام پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے اونہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان لوگوں کا ذبیحہ طعام اہل کتاب میں داخل ہی نہیں اس لئے اوس کے حلال ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور ان کے غلط عمل کی وجہ سے آیات قرآنی میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

اسی لئے تمام ائمہ تفسیر ابن جریر۔ ابن کثیر۔ ابو حیان وغیرہ اس پر متفق ہیں کہ سورہ بقرہ اور انعام کی آیات میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا۔ یہی جمہور صحابہ و تابعین کا مذہب ہے۔ جیسا کہ بحوالہ ابن کثیر اوپر نقل ہو چکا ہے اور تفسیر بحر محیط میں بالفاظ ذیل مذکور ہے۔

وذھب الی ان الکتابی اذا لم یذکر اللہ علی الذبیحۃ وذکر غیر اللہ لم تؤکل وبہ قال ابو الدرداء وعبادۃ بن الصامت وجماعۃ من الصحابۃ وبہ قال ابو حنیفۃ وابو یوسف ومحمد وزفر ومالک وکرہ النخعی والثوری اکل ما ذبح واھل بہ لغیر اللہ (بحر محیط صد ۴۳۱ ج ۲)

ان کا مذہب یہ ہے کہ کتابی اگر ذبیحے پر اللہ کا نام نہ لے اور اللہ کے سوا کوئی نام لے تو اس کا کھانا جائز نہیں، یہی قول ہے ابو الدرداءؓ عبادۃ بن الصامتؓ اور صحابہ کرام کی ایک

جماعت کا، اور یہی ابوحنیفہؒ ابویوسفؒ
محمدؒ زفرؒ اور مالکؒ کا مذہب ہے نخعیؒ
اور ثوریؒ اس کے کھانے کو مکروہ قرار
دیتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہ و تابعین اور اسلاف اُمت کا
اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اہل کتاب کا اصل مذہب
زمانہ نزول قرآن میں بھی یہی تھا کہ جس جانور پر غیر اللہ کا
نام لیا جائے یا قصداً اللہ کا نام چھوڑا جائے وہ حرام ہے
اسی طرح نکاح کی حلت و حرمت میں بھی اہل کتاب کا اصل
مذہب موجودہ زمانے تک اکثر چیزوں میں اسلامی
شریعت کے مطابق ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ اہل کتاب میں
پایا گیا وہ جاہل عوام کی اغلاط ہیں اون کا مذہب نہیں ہے۔

موجودہ تورات و انجیل جو مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی
ملتی ہیں، اون سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہوں
اون کے مندرجہ ذیل اقوال

بائبل کے عہدنامہ قدیم میں (جو موجودہ زمانے کے یہود و
نصاریٰ دونوں کے نزدیک مسلم ہے) ذبیحہ کے متعلق یہ احکام
ہیں۔

(۱) جو جانور خود بخود مرگیا ہو اور جس کو درندوں
نے پھاڑا ہو اُنکی چربی اور اور کام میں
لاؤ تو لاؤ پر تم اسے کسی حال میں نہ کھانا
(احبار ۷، ۲۴)

(۲) پر گوشت کو تو اپنے سب پھاٹکوں کے
اندر اپنے دل کی رغبت اور خداوند اپنے
خدا کی دی ہوئی برکت کے موافق ذبح
کر کے کھا سکے گا .... لیکن
تم خون کو بالکل نہ کھانا (استثنا ۱۲: ۱۵)

(۳) تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت اور لہو
اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں ا
حرام کاری سے پرہیز کرو۔
(عہدنامہ جدید کتاب اعمال ۱۵: ۲۹)

(۴) عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا پولس
کرنتھیوں کے نام پہلے خط میں لکھتا ہے
جو قربانی غیر قومیں کرتی ہیں شیاطین کیلئے
قربانی کرتی ہیں نہ کہ خدا کے لئے اور میں
نہیں چاہتا کہ تم شیاطین کے شریک ہو تم
خداوند کے پیالے اور شیاطین کے پیالے
دونوں میں سے نہیں پی سکتے۔
(۱- کرنتھیون ۱۰: ۲۰ و ۲۱)

(۵) کتاب اعمال حوارین میں ہے۔
ہم نے یہ فیصلہ کر کے لکھا تھا کہ وہ صرف
بتوں کی قربانی کے گوشت سے اور لہو اور
گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے
اپنے آپ کو بچائے رکھیں (اعمال ۲۱: ۲۵)

یہ تورات و انجیل کی وہ تصریحات ہیں جو آجکل کی بائبل
سوسائیٹیوں نے چھاپی ہوئی ہیں جن میں سینکڑوں تحریفات
و ترمیمات کے بعد بھی بعینہٖ قرآن کریم کے احکام کے مطابق
یہ چیزیں باقی ہیں۔ قرآن کریم کی آیت یہ ہے۔

حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل
بغیر الله به والمنخنقة والموقوذة والمتردیة والنطیحة
وما اکل السبع الا ما ذکیتم وما ذبح علی النصب.
(المائدہ ۳)

تم پر حرام کر دیا گیا۔ مردار اور خون اور خنزیر کا
گوشت اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام
پکارا گیا ہو اور گلا گھونٹا ہوا، اور چوٹ کھا کر
مرا ہوا، اور گر کر مرا ہوا اور سینگ کھا کر مرا
ہوا، اور جسے درندے نے کھایا ہو، اِلّا یہ کہ
تم نے اس کو پاک کر لیا ہو اور وہ جانور جو

بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے۔

اس آیت نے میتۃ یعنی خود مرا ہوا جانور اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا اور گلا گھونٹا ہوا جانور اور چوٹ سے مارا یا اونچی جگہ سے گر کر مرا ہوا یا سینگوں کی چوٹ سے مارا ہوا اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو سب حرام قرار دیئے ہیں۔

تورات و انجیل کی مذکورہ تصریحات میں بھی لحم خنزیر کے علاوہ تقریباً سبھی کو حرام قرار دیا ہے۔ صرف چوٹ سے یا اونچی جگہ سے گر کر یا سینگوں سے مرنے والے جانور کی تفصیل اگرچہ مذکور نہیں ہے۔ مگر وہ سب تقریباً خود مرے یا گلا گھونٹ کر مارے ہوئے کے حکم میں داخل ہیں۔

اسی طرح قرآن کریم نے ذبیحہ پر اللہ کا نام لینے کی تاکید فرمائی ہے۔ واذکروا اسم اللہ علیہ اور جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسکو حرام کیا ہے لا تاکلوا عالم یذکر اسم اللہ علیہ بائبل میں کتاب استثناء کی عبارت مذکورہ[۲] سے بھی اس کی تاکید مفہوم ہوتی ہے کہ جانور کو اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے۔

اسی طرح نکاح کے معاملات میں بھی اہل کتاب کا مذہب اکثر چیزوں میں شریعت اسلام کے مطابق ہے ملاحظہ ہو احبار ۱۸، ۶ تا ۱۹ جس میں ایک طویل فہرست محرمات کی دیگئی ہے جن میں بیشتر وہی ہیں جن کو قرآن نے حرام کیا ہے یہاں تک کہ جمع بین الاختین یعنی دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں جمع کی حرمت اور حالت حیض میں صحبت کا حرام ہونا بھی اس میں مصرح ہے۔

نیز بائبل میں اس کی بھی تصریح ہے کہ بت پرست اور مشرک اقوام سے نکاح جائز نہیں۔ موجودہ تورات کے الفاظ یہ ہیں۔

> تو ان سے بیاہ شادی بھی نہ کرنا۔ نہ ان کے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا اور نہ اپنے بیٹوں کیلئے ان کی بیٹیاں لینا۔ کیونکہ وہ میرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کر دیں گے تاکہ وہ اور عبادت کریں۔ (استثناء ۷: ۳ و ۴)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن میں اہل کتاب کے ذبائح اور انکی عورتوں سے نکاح کو حلال اور دوسرے کفار کے ذبائح اور نساء کو حرام قرار دینے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں اہل کتاب کا اصل مذہب آج تک بھی اسلامی قانون کے مطابق ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ان کے عوام میں پایا جاتا ہے وہ جاہلوں کی اغلاط ہیں اون کا مذہب نہیں ہے۔

اسی لئے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک سورہ بقرہ۔ انعام۔ مائدہ کی تمام آیات میں کوئی تضاد یا نسخ یا تخصیص نہیں ہے اور جن علماء تابعین نے غلط کار عوام کے عمل کو بھی ہجا اہل کتاب کے حکم میں شامل رکھا اور آیات بقرہ و انعام میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کیا ہے۔ اوس کی بھی بنیاد یہ ہے کہ نصاریٰ جن کا قول یہ ہے۔ ان اللہ ھو المسیح بن مریم یعنی اللہ تو عیسیٰ بن مریم ہی ہیں، یہ لوگ اگر اللہ کا نام بھی لیں تو اوس سے بھی مراد عیسیٰ بن مریم ہی لیتے ہیں اس لئے اون کے ذبیحہ میں اللہ کا نام لینا یا مسیح کا نام لینا برابر ہو گیا۔ اس بناء پر ان حضرات تابعین نے ذبائح کتاب میں اس کی اجازت دیدی ہے۔ ابن عربی نے احکام القرآن میں اس بنیاد کی وضاحت فرمائی ہے[۱] (احکام ابن عربی ص ۲۲۹ ج ۱)

مگر جمہور امت نے اوس کو قبول نہیں کیا۔ جیسا کہ بحوالہ تفسیر ابن کثیر و تفسیر بحر محیط ابھی گزر چکا ہے۔ اور تفسیر مظہری میں اقوال مختلفہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

والصحیح المختار عندنا ھو القول الاول یعنی ذبائح اھل الکتاب تارکا للتسمیۃ عامدا او علی غیر اسم اللہ تعالی لا یوکل ان علم ذلک یقینا او کان غالب حالھم ذلک وھو محمل النھی عن اکل ذبائح نصاری العرب ومحمل قول علی رض لا تاکلو من ذبائح نصاری بنی تغلب فانھم تمسکوا من النصرانیۃ بشیء الا بشرب الخمر فلعل علیا رض علم من

حالهم انهم لا یسمون الله عند الذبح او یذبحون علی غیر اسم الله

ذلك اعلم نصاری العجم ان کان عادتهم الذبح علی غیر اسم الله تعالیٰ غالباً لا یوکل ذبیحتهم ولا شک ان النصاریٰ فی هذا الزمان لا یذبحون بل یقتلون بالوقذ غالباً فلا یحل طعامهم

(تفسیر مظہری صت۳ ج ۳)

اور صحیح اور مختار ہمارے نزدیک وہ پہلا ہی قول ہے یعنی یہ کہ اہل کتاب کے ذبائح جن پر قصداً اللہ کا نام لینا چھوڑ دیا ہو یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے ہوں وہ حلال نہیں اگر یقینی طور پر اس کا علم ہو جائے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا یا غیر اللہ کا لیا ہے یا اہل کتاب کی عام عادت ہی یہ ہو جائے۔

جن بزرگوں نے عرب کے نصاریٰ کے ذبائح کو منع کیا ہے۔ ان کے قول کا مقصد بھی یہی ہے اسی طرح حضرت علی رضؓ نے جو یہ فرمایا کہ نصاری بنی تغلب کے ذبائح کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے بجز شراب نوشی کے اور کچھ نہیں لیا۔ اس کا محمل بھی یہی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ ثابت ہوا ہو گا کہ بنی تغلب اپنے ذبائح پر اللہ کا نام نہیں لیتے یا غیر اللہ کا نام لیتے ہیں۔

پس یہی حکم عجمی نصاری کا بھی ہے کہ اگر انکی عادت یہی ہو جائے کہ عام طور پر غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں تو ان کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں اور اس میں شک نہیں کہ آجکل کے نصاری تو ذبح ہی نہیں کرتے بلکہ عام طور پر چوٹ مار کر ہلاک کرتے ہیں اس لئے ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔

(باقی آئندہ)

اِک دیا اور بجھا

ابھی برصغیر کے مسلمانوں کیلئے حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا غم تازہ تھا کہ آج جبکہ پرچہ پریس جا رہا ہے، اچانک روزنامہ جنگ کراچی سے استاذ الکل حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ نائب مہتمم دار العلوم دیوبند کی وفات کی المناک اطلاع نے دل پر ایک نیا چرکا لگا دیا، حضرت مولانا بلیاویؒ برصغیر کے تقریباً تمام مشاہیر علماء کے جلیل القدر استاذ تھے اور علم و فضل، ورع و تقویٰ میں اسلامی قرون کی ایک یادگار، آپ کے ساتھ پوری ایک قرن کی تاریخ ختم ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور تمام مسلمانوں کو صبر جمیل ——— (ادارہ)

تقلید کے بارے میں ایک گفتگو

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مدظلہم

ہمارے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا ایک بھانجہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہو کر علیگڈھ میں ایک ڈاکٹر کا کمپونڈر بن گیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب جماعت اہل حدیث سے منسلک تھے۔ اس نے اپنے کمپونڈر کو بھی جماعت اہل حدیث میں شامل کرنے کی کوشش کی اور اپنے مسلک کی کتابیں مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ تین سال تک وہ اس مسلک کی کتابیں دیکھتا رہا، بالآخر غیر مقلد بن گیا۔ تین سال کے بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے سہارنپور آیا اور آتے ہی صاف کہدیا کہ اب میں حنفی نہیں ہوں بلکہ جماعت اہل حدیث میں شامل ہو گیا ہوں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بہت افسوس ہوا اور مدرسہ مظاہر علوم کے علماء سے فرمایا کہ اپنے اس شاگرد کو سمجھاؤ اور اس کے شبہات کا ازالہ کرو۔ تین دن تک وہ علماء مظاہر علوم سے گفتگو کرتا رہا اور اپنے مسلک جدید پر جما رہا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یہ بندہ بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کو تھانہ بھون سے سہارنپور پہونچ گیا مجھے دیکھ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ بڑے خوش ہوئے اور فرمایا تم بڑے اچھے موقع پر آئے۔ یہ تمہارا شاگرد حقیقت سے بیزار ہو کر جماعت اہل حدیث میں شامل ہو گیا ہے۔ تین دن سے علماء مظاہر علوم اس کو سمجھا رہے ہیں مگر وہ اپنی بات پر جما ہوا ہے تم بھی اس کو سمجھاؤ۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ بھی مجھ سے ملنے آگیا۔ میں نے کہا بعد عشاء کے مجھ سے ملو۔ جب وہ وعدہ کر کے چلا گیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس نے تین سال تک اہلحدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اس لئے نظر وسیع ہو گئی ہے۔ گفتگو میں اس کا لحاظ رہے۔ میں نے کہا انشاء اللہ اس کا لحاظ رکھوں گا کہ آپ بھی دعاء و توجہ سے مدد فرمائیں چنانچہ حسب قرارداد بعد عشاء کے وہ میرے پاس آیا جبکہ میں بستر پر لیٹ گیا تھا۔ وہ پاؤں دبانے لگا۔ میں نے بھی انکار نہ کیا۔ آخر تو شاگرد تھا۔ اب حسب ذیل گفتگو ہوئی:۔

ظفر:۔ ہاں صاحبزادے بتلاؤ اب تمہارا مسلک کیا ہے؟

شاگرد:۔ عمل بالحدیث الصحیح۔

ظفر:۔ بس عمل بالحدیث الصحیح؟ عمل بالقرآن نہیں؟

شاگرد:۔ جناب والا! عمل بالقرآن تو سب سے پہلے ہے۔ اس کے بعد عمل بالحدیث الصحیح ہے۔

ظفر:۔ اگر تمہارا یہ مسلک ہوتا تو پہلے عمل بالقرآن کو بیان کر کے پھر عمل بالحدیث کا نام لیتے۔

شاگرد:۔ وہ تو ظاہر ہے اس لئے بیان کی ضرورت نہ سمجھی

ظفر:۔ یہ تو تم نے بات بنائی ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اہلحدیث قرآن پر عمل نہیں کرتے۔ لیکن حنفیہ کا اصول یہ ہے کہ وہ اول قرآن کو دیکھتے ہیں۔ پھر احادیث کو۔ اور جس حدیث کو نص قرآن کے موافق پاتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں اور بقیہ احادیث کو محامل حسنہ پر محمول کرتے ہیں۔ اب میں تم کو بتلاتا ہوں کہ جن مسائل مشہورہ میں ہمارا اور اہل حدیث کا اختلاف ہے۔ ان کے لئے ہم نے اول قرآن کو دیکھا اور جن احادیث کو نصوص قرآنیہ کے موافق پایا ان کو ترجیح دی۔ قراءۃ فاتحہ خلف الامام ہی کا مسئلہ لے لو۔ ہم نے اس کے لئے قرآن کو پہلے دیکھا سورہ اعراف میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون ۝ (جب قرآن

پڑھا جائے تو اسس کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا؛ اس سے صاف معلوم ہوا کہ امام کے ساتھ ساتھ قراءت نہ کرنا چاہیئے بلکہ قرآن کو سننا اور خاموش رہنا چاہیئے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ یہ آیت باتفاق قراءۃ خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے* اسس کے بعد ہم نے احادیث کو دیکھا تو کسی حدیث میں بھی یہ نہیں آیا کہ اذا قرأ الامام فاقرءوا (جب امام قراءت کرے تم بھی قراءت کرو)۔ اذا کبر فکبروا واذا رکع فارکعوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا ولک الحمد واذا سجد فاسجدوا۔ تو حدیثوں میں موجود ہے کہ جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو، جب رکوع کرے رکوع کرو جب سمع اللہ لمن حمدہ کہے تم ربنا ولک الحمد کہو، جب سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو۔ مگر یہ کہیں نہیں کہ جب وہ قراءت کرے تم بھی قراءت کرو۔ بلکہ اگر ہے تو اذا قرأ فانصتوا ہے کہ جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔ امام مسلمؒ اور امام احمدؒ نے اور بہت سے محدثین نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ حنفیہ نے اس کو ترجیح دی اور بقیہ احادیث کو محامل حسنہ پر محمول کیا۔ آمین کے مسئلہ میں بھی حنفیہ نے اول قرآن کو دیکھا۔ چونکہ آمین دعا ہے جیسا امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔ اس لئے دعاء کے بارے میں قرآن کو دیکھا تو اسس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملا۔ ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ (اپنے رب سے تضرع کی ساتھ آہستہ دعا کرو) تو ہم نے اس مسئلہ میں شعبہؒ کی روایت کو ترجیح دی جس میں وارد ہے فقال آمین وخفض بھا صوتہ (آپ نے سورہ فاتحہ کے ختم پر آمین کہی اور آواز کو پست کیا یعنی آہستہ سے آمین کہی۔ یہ حدیث ترمذی میں ہے) نماز کے اندر رفع یدین کے بارے میں بھی ہم نے اول قرآن کو دیکھا تو حق تعالیٰ کا ارشاد ملا۔ قوموا للہ قانتین اور والذین ھم فی صلاتھم خاشعون ۝ پہلی آیت میں ارشاد ہے کہ اللہ کے سامنے سکوت اور سکون کے ساتھ کھڑے ہو۔ دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ نماز میں خشوع کرنے والے ہیں وہ کامیاب ہیں اور خشوع کے معنی بھی سکون ہی کے ہیں۔ اس کے بعد احادیث کو دیکھا تو صحیح مسلمؒ میں روایت موجود ہے کہ صحابہ نماز میں سلام کے وقت ہاتھ اٹھا کر السلام علی فلان السلام علی فلان کہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مالی اراکم رافعی ایدیکم کانھا اذناب خیل شمس اسکنوا فی الصلوۃ (یہ کیا حرکت ہے کہ تم اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہو جیسے گھوڑے دم اٹھاتے ہیں۔ نماز میں سکون سے رہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز میں سلام کے وقت بھی ہاتھ اٹھانا سکون کے خلاف ہے حالانکہ سلام کا وقت نماز میں داخل بھی ہے اور خارج بھی ہے تو رکوع کے وقت ہاتھ اٹھانا کیسے مناسب ہوگا کہ رکوع تو بالکل داخل صلوٰۃ ہے۔ ہاں تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھانا درست ہے کہ وہ داخل صلوٰۃ یعنی رکن نہیں بلکہ شرط صلوٰۃ ہے۔ اس لئے حنفیہ نے ان روایات کو ترجیح دی ہے جن میں رکوع کے وقت ترک رفع یدین آیا ہے۔ اسی پر اور مسائل کو قیاس کرو کہ حنفیہ اول قرآن کو دیکھتے ہیں پھر احادیث میں سے جو نص قرآن کے موافق یا قریب ہوں ان کو ترجیح دیتے ہیں۔

شاگرد: واقعی میں نے اب تک اسس نکتہ پر غور نہیں کیا تھا۔ مگر یہ شبہ اب بھی باقی ہے کہ حنفیہ بعض مسائل میں صحیح احادیث کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

ظفر: عزیز من! پہلے تم صحیح حدیث کی تعریف تو بیان کرو مگر دیکھو حدیث صحیح کی تعریف میں کسی کی تقلید نہ کرنا۔

شاگرد: یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور پسینہ پسینہ ہو گیا پھر کہنے لگا کہ میں سمجھ گیا۔ واقعی بغیر تقلید کے کسی حدیث کو صحیح کہنا مشکل ہے۔ پھر بخاریؒ مسلم و ترمذی وغیرہ کی تقلید تو جائز ہو اور امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی تقلید ناجائز ہو۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اب میں مسلک اہل حدیث کو

---

* بعض علماء نے اس کو خطبۂ جمعہ سے متعلق کہا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ خطبہ کو بھی اسی کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ میں نہ جمعہ تھا

چھوڑتا ہوں اور مسلک حنفی اختیار کرتا ہوں۔

ظفر:۔ تم بہت جلدی سمجھ گئے اس سے دل خوش ہوا مگر میں اس کی اچھی طرح وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ تقلید کا انکار کرتے اور تقلید کی مذمت کرتے ہیں وہ بھی کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف یا حسن بغیر تقلید کے نہیں کہہ سکتے۔ رہا یہ عذر کہ حق تعالیٰ نے خبر صادق اور شہادت عادل کو حجت قرار دیا ہے تو یہ تقلید نہیں بلکہ اتباع حجت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث کو صحیح یا ضعیف کہنا محض خبر نہیں بلکہ اس کا مدار محدث کے ظن و اجتہاد پر ہے۔ بعض دفعہ سند کے راوی سب ثقہ ہوتے ہیں مگر حدیث معلل ہوتی ہے اور علت کی معرفت حاذقین ہی کو ہوتی ہے، ہر محدث کو نہیں ہوتی۔ ابن ابی حاتمؒ نے کتاب العلل میں عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حدیث کی معرفت بھی الہام ہے۔ ابن نمیر نے کہا واقعی سچ ہے۔ اگر محدث سے پوچھو کہ تم نے کیسے کہا (کہ یہ حدیث صحیح ہے یا معلل ہے) تو اس کے پاس کچھ جواب نہ ہوگا۔ احمد بن صالحؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کی معرفت بھی ایسی ہی ہے جیسے سونے اور پیتل کا پہچاننا۔ کیونکہ جوہر کو جوہری ہی پہچانتا ہے۔ پرکھنے والے سے اگر پوچھا جائے کہ تم نے اس کو کھرا اس کو کھوٹا کیسے کہا تو وہ کوئی دلیل نہیں بیان کر سکے گا۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ ائمہ حدیث کا کسی حدیث کو صحیح یا معلل کہنا محض خبر نہیں بلکہ ان کا یہ قول ان کے ظن اور اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے۔ تو اس باب میں ان کی بات پر اعتماد کرنا عین تقلید ہے۔ علامہ ابن القیمؒ کا یہ فرمانا کہ یہ احکام میں تقلید نہیں، اس لئے صحیح نہیں کہ حدیث صحیح پر عمل کرنا شرعاً واجب اور ضعیف پہ عمل کرنا غیر واجب اور موضوع پر عمل کرنا حرام ہے تو یہ تقلید احکام ہی میں ہے۔ غیر احکام میں تو نہیں۔ اسی لئے فقہاء نے بحث سنت کو اور اس کے قبول و رد کے قواعد کو اصول فقہ میں بھی بیان کیا ہے۔ علامہ ابن القیمؒ کا اس کو اتباع کہنا تقلید نہ کہنا لفظوں کا ہیر پھیر ہے حقیقت ایک ہی ہے ؎ عبارا تنا شتی وحسنک واحد ۔ وکل الی ذاک الجمال یشیر۔

عزیزمن! قرآن کا صحیح پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ یقیناً واجب ہے اور غلط پڑھنا حرام ہے۔ اب تم بتلاؤ کہ بغیر ائمہ قراءت کی تقلید کے تم قرآن صحیح پڑھ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں! اور یہ بھی تقلید فی الاحکام ہی ہے۔ اسی طرح حدیث کو پہچاننا اور صحیح کو ضعیف سے الگ کرنا بھی واجب ہے اور اس میں تقلید ائمہ سے چارہ نہیں۔ پھر جماعت اہل حدیث کس منہ سے تقلید کا انکار کرتی ہے؟ پھر تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ محدثین نے جو اصول حدیث کی صحت و ضعف کے لئے مقرر کئے ہیں وہ آسمانی وحی سے مقرر نہیں کئے بلکہ اپنے ظن و اجتہاد سے مقرر کئے ہیں ایسے ہی ہمارے فقہاء نے بھی صحت و ضعف حدیث کیلئے کچھ اصول مقرر کئے ہیں جو اصول فقہ کی بحث السنہ میں مذکور ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایک حدیث محدثین کے اصول پر صحیح ہمارے اصول پر ضعیف ہو یا ہمارے اصول پر صحیح ہو محدثین کے اصول پر ضعیف ہو تو اس میں نزاع کرنا غلط ہے دلائل میں غور کرنا چاہیئے کہ دلیل سے کس کے اصول قوی ہیں آخر میں اتنا اور بتلا دوں کہ حنفیہ سے زیادہ حدیث کا اتباع کوئی نہیں کرتا۔ حنفیہ تو قرون ثلثہ میں مرسل اور منقطع کو بھی حجت مانتے ہیں جس کو اہل حدیث رد کر دیتے ہیں اور مراسیل مقاطیع کا ذخیرہ احادیث مرفوعہ سے کم نہیں، کچھ زیادہ ہی ہے، تو یہ لوگ حدیث کے آدھے ذخیرے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر مرفوعات میں سے بھی یہ لوگ صحیح یا حسن ہی کو لیتے ہیں ضعیف کو رد کر دیتے ہیں اور حنفیہ کے نزدیک حدیث ضعیف بھی قیاس سے مقدم ہے بلکہ قول صحابہؓ و قول تابعی کبیر بھی قیاس سے مقدم ہے اب تم ہی بتلاؤ کہ عامل بالحدیث کون ہے اور تارکِ حدیث کون؟ رہا یہ کہ بعض مسائل میں حنفیہ حدیث صحیح کو چھوڑ دیتے ہیں اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ اس صورت میں جس حدیث

(دوسری قسط)

ادیب الملک جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی

سخن راست

ہاں تو بندہ نواز گذشتہ ملاقات میں ہم نے عرض کیا تھا کہ اغیار نے اسلام کو مجروح کرنے کی سعیٔ ناکام کی اور کر رہے ہیں۔ باطل سدا حق کے خلاف ایسی سعی کرتا رہے گا۔ تاہم جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے، باطل سدا منہ کی کھاتا رہا ہے وہ اپنی سفلہ کاریوں سے باز نہیں آتا۔ مسلمانوں کے اطوار و کردار بدلے لیکن اسلام جوں کا توں حی و قائم رہا اور رہتی دنیا تک رہے گا۔ اس کی نہ شان میں فرق آئے گا نہ آن بان میں۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبائیں گے

دین متین نے صحرائے عرب سے سر اٹھایا تھا۔ ریگستان میں، بے آب بیابان میں پروان چڑھا تھا۔ اس میں تمام وہ خصوصیات ہیں جو بلند و بالا کھجور میں پائی جاتی ہیں مثلاً ——— ہر رگ و ریشہ کام کا۔ پھول پتی کارآمد پھل غذا گٹھلی دوا۔ جڑیں گہری اور مضبوط۔ بلند قامت۔ استوار۔ بادِ سموم کے تھپیڑوں سے جھک جائے، دم کے دم میں پوسیدہ حاضر کرنے سے جنبش نہیں، اپنی بقا کے لئے کم از کم کا طالب۔ دوسروں کے واسطے بیش از بیش حیات بخش۔ فروعات سے معرا۔ چوٹی پر ایک گٹھا ہوا گل دستہ۔ پھول پھل پتے سب ایک جگہ دوش بدوش، یک جہتی اور سلوک کے آئینہ دار۔ سایہ دور تک دے۔ جگہ کم سے کم گھیرے برگ و بار کی ہر فصل یا ہر نسل اس کو ایک پوری بلند کر جائے آنے والوں کو بلند تر مقام بخشے ——— اب ذرا اسی تسلسل میں اپنے اسلام کو نظر انصاف سے دیکھئے ——— کارآمد اور فطری اصولوں کا حامل۔ قوی الاساس۔ رفیع النظر۔ راستی و راست بازی کا حامل۔ دب دب کر اُبھرنے والا۔ مرکز سے نہ ہلنے والا۔ آسانیاں اور فراخیاں فراہم کرنے والا۔ دے تسلیم و رضا کا طالب۔ فرقہ بندی سے متنفر۔ وحدت کا پرستار۔ مرکزیت کا دلدادہ۔ آفاق کا حامی۔ رسم و رواج کی مکروہ پہنائیوں سے معرا۔ ہلکا پھلکا دور رس۔ بلندیوں کا رہ نما۔ تنازع بقا کا درس دینے والا۔

عزیزو! یہ ہیں معدودے چند پہلو اس دین برحق کے جو ربِ کعبہ نے اپنے حبیب رسولِ عربی کے توسل سے ابنائے آدم کو عطا فرمایا۔ اور جس سے ہم گناہ گاروں کو نوازا۔ اس اللہ کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا جس نے ایسی نعمت سے

نہیں بہرہ مند فرمایا۔ خدا شاہد ہے کہ اکثر دعا کے سلسلے میں یہ خیال آتا ہے کہ اس نعمت کے بعد اور کیا طلب کروں بس اتنی التجا اور کرسکتا ہوں کہ اسی پر انجام بخیر ہو ـــــ بہر نوع و بہر کیف یہ ہے وہ تجاوزین جس سے دیگر ادیانِ عالم گھبرائے ہوئے ہیں۔ یہ ہے وہ مذہب جس سے دوسرے مذاہب عالم تھرائے ہوئے ہیں ـــــ جب تک تم نے اس شمع سے لو لگائی دوسروں کے دیئے گُل کر دیئے۔ جب تم اس کی ضیا پاشیوں سے دور ہو گئے تمہارا مقدر تیرہ و تاریک ہوگیا۔

تمہارے مذہب کے اُصول دوسروں نے اپنائے اور ترقیاں حاصل کیں۔ عربوں کے عروج و زوال کا عیسائی مصنف آخر میں لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اُصول ترک کردیئے زوال پذیر ہوئے۔ عیسائی ان کے اُصولوں پر کاربند ہوئے بامِ عروج تک پہنچے ـــــ میرے عزیزو، ایک نکتہ کی بات ہے وہ کبھی نہ بھولنا۔ تم میں اور غیر مذہب والوں میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ ہے لا الٰہ الا اللہ کا۔ تمہارے سینوں کی گہرائیوں میں، تمہارے قلب و سویدائے قلب میں لا الٰہ الا اللہ کی چنگاری ہے، اور وہ اس سے محروم۔ تسلیم کہ خس خاشاک میں دب گئی، ماحول کی خاک اس پر پڑ گئی، مادیت کے انبار نے اسے گراں بار کردیا۔ ہوا و ہوس کی آلودگی نے اُسے ڈھک لیا۔ ہماری سیاہ کاریوں نے اس کی آب و تاب کم و کم تر کردی۔ بہرحال یہ نہ بجھی ہے نہ انشاء اللہ کبھی بجھ سکتی ہے اغیار نے تمہارے کردار، اطوار اور اعمال دیکھ کر تمہاری ترقیاں دیکھ کر تمہارے اصول اپنائے۔ تمہارے عقیدے پر نہ آئے۔ یہی کسر رہ گئی ـــــ ان کور چشموں نے یہ نکتہ نہ پایا کہ روشن کنِ روح و قلب عقیدہ ہے اصول نہیں ـــــ حیاتِ ابنائے آدم میں اشد ترین قوتِ فعّال جذبہ ہے۔ اصولِ عمل یہ شدت نہیں اور محرکِ جذبہ کا مہمیز زن عقیدہ ہے ـــــ عقیدہ انسان سے جو کچھ کرا دیتا ہے، جن حدوں تک لے جاتا اور جس بامِ عروج تک پہنچاتا ہے اصول کے پر پرواز ان منازلِ ارفع و بلند سے محروم ہیں ـــــ جذبہ اور اصول کے عمل کی شدت کا فرق یوں سمجھئے کہ ایک عورت جو اصولاً ہمدرد ہے، ایک شخص کو سر راہ کسی بچے کو شدید زد و کوب کرتے دیکھتی ہے۔ وہ اپنا برقعہ پھڑ پھڑاتی جاتی ہے اور کہتی ہے " ارے توبہ توبہ کیوں بچے بچارے کو مارے ڈالتا ہے۔ کیا غضب کر رہا ہے۔ پیارے پچکار کر سمجھا۔" اور اگر یہی عورت کسی کو اپنے بیٹے پر تشدد کرتے دیکھتی ہے تو تڑپ کر دست و گریبان ہوجاتی ہے۔ یہاں جذبہ کارفرما تھا وہاں محض اصول۔ زندگی میں جذبہ اور اصول میں تصادم بھی ہوجاتا ہے مثلاً ایک لڑکا کسی کتے کے پتھر مارتا ہے اور وہ کتا پلٹ کر اسے کاٹتا ہے تو لڑکے کی ماں کتے کی ہڈیاں توڑ ڈالتی ہے اتنے ڈنڈے برساتی ہے حالانکہ اصول انصاف اس کا متقاضی نہ تھا اس ہی تخیل کو اقبال اپنے انداز خاص میں کہتا ہے:

بے خطر کود گیا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مسلمانوں کے محیّر کنِ عقل و خرد کارناموں کی پشت پر جو حقیقی طاقت تھی اغیار نے اسے نہ اپنایا صرف اصولوں

کو اپنایا۔ اور ہمیں "فینٹک" مذہبی دیوانہ کہہ کر اپنا دل خوش کر لیا اور دامن بچا کر نکل گئے۔ یہ عقل کے پرستار تھے۔ ہم جذبہ کے شیدائی۔ اسی مضمون کو شاعر اسلام اقبال کہتا ہے:۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

مولینا روم فرماتے ہیں:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

یہ عقل و خرد کے پابہ جولاں جن راہوں پر لنگڑاتے رہے، ٹھوکریں کھاتے رہے، ہم اہل عقیدہ ان کے بقول ان کی نظروں کے سامنے ان گھاٹیوں سے نغمہ خواں و نعرہ زناں کلیلیں بھرتے گذر گئے ——— ہمارے اصولوں کو اپنانے والوں نے مضحکہ خیز و تمسخر آمیز حد تک ہمارے عادات و خصائل تک کو اپنایا۔ ایسوں ایسوں نے ہماری روزمرہ کی چیزوں کی پیروی اپنے اوپر لازم کر لی جن کی عقل و خرد پر ان کی قوموں کو ناز تھا۔ مثلاً گاندھی جی مہاراج نے قرونِ اولیٰ کے اہل دین کی خصوصیات اپنے میں پیدا کرنے کی آرزو میں کھجور اور بکری کا دودھ اپنی غذا بنایا۔ اس شخص نے اپنے جسم کو وہ غذا دی جو ہمارے اسلاف کو میسر تھی۔ لیکن اپنی روح کو اس نورانی غذا سے محروم رکھا۔ جس نے فی الحقیقت عربوں کو عرب بنایا! اوران بادیہ نشینوں اور صحرا نوردوں کو وہ مقام عطا کیا اس کو آج بھی تمام عالم کے مورخ سنہری حروف میں لکھتے ہیں اور تمام و کمال اقوام عالم اس پر عش عش کرتی ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں آنکھ کے اندھے اور نام نین سکھ تھے تو اپنی قوم کے بقول مہاتما یعنی مہا آتما اور آتما ہی کو بھوکا پیاسا رکھا۔ اس کی جانب توجہ نہ فرمائی۔ مادی جسم میں گھرے رہے ———

عزیزو، یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ گاندھی جی کا ذہن مادہ میں کیوں الجھا رہا۔ اس مکڑی کے جالے میں سے کیوں نہ نکل سکا۔ غذائے جسمانی کی تقلید کی جو شربت روح پرور روح کو قوت دیتا اس جانب ذہن کیوں نہ رجوع ہوا۔ عزیزان من جو بھی اجسام پرستی کرے گا اس کا ذہن ایسے سانچے میں ڈھل جائے گا کہ آب و گل آتش و باد سے باہر نہ نکل سکے گا۔ بت پرستی کا بدترین اور مکروہ ترین اثر جو کردار و عقل انسانی پر مرتب ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ یہ عمل اس کے ادراک کو عناصر کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے۔ جب خاکی زمین کو پوجو گے جب دھرتی ماتا کی پرستش کرو گے تو زمین کی قوتِ ثقل تم کو پستی کی جانب لے جائے گی۔ تمہارا ذہن طائر لاہوتی نہیں بن سکے گا حشرات الارض کا مقام پائے گا۔ اس کے بعد جب ذات لم یزل منزہ بالذات و بالصفات کی عبدیت اختیار کرو گے، تمہارے ذہن کی پرواز تا حدِ سدرہ ہوگی۔

بہرصورت غلام یہ عرض کر رہا تھا کہ اغیار نے آپ کے اصولوں کی تقلید کی اور دل بھر کی۔ آج بھی اس کے لفظ تک سے پرہیز کرنے والے گھاس و دو حسبیر ٹرین) گوشت خواری اختیار کر رہے ہیں تاکہ آپ جیسے جی دار جیالے بن سکیں تقسیم سے قبل جب ہم وہاں تھے تب بھی خیر سے یہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ نئے سیٹھ مہاجن اپنے رام مورتی نتھو چھجو پہلوانوں کو رام رام کرتے جاتے اور

یخنیاں پلاتے جاتے تھے۔ ان عقل کے اندھوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ ؎

جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

جن اہل دین نے ساٹھ سال کے قلیل عرصے میں ایک تہائی معلوم دنیا زیرنگین کی۔ ان کو کبھی پیٹ بھر کھانا میسر نہیں آیا تھا۔ بازوئے خیبر شکن میں عقیدہ اور جذبہ کی قوت تھی۔ ایمان اور ایقان کی قوت تھی۔ لاالٰہ کی قوت تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے اور دل بھی چاہتا ہے کہ لاالٰہ کی قوت پر بھی کچھ عرض خدمت کروں شاید انہی چند سطور کے طفیل اس گناہ گار کی بخشش ہو جائے ؎

کارے وبخت کارے دردے وبخت دردے

——— افسوس یہ ہے کہ جوانی میں جب قلم میں طاقت تھی، دماغ میں قوت، خون میں روانی۔ اسوقت تو یہ خامہ فرسا واللہ اعلم کیا کچھ لکھتا رہا۔ اب آخر عمر اللہ کے نام پر لکھنے بیٹھا ہے۔ جبکہ دماغ جواب دے چکا۔ قویٰ مضمحل ہو گئے قلم بھی کمر شکستہ۔ آفات و آلام سے ذہن پراگندہ۔ خاطر پریشان۔ بہرحال اگر اللہ کو لکھوانا ہے تو لکھوائے گا۔ السعی منی والاتمام من اللہ ——— چل رے خامہ بسم اللہ۔

پیارے کلمہ شریک بھائیو! کلمہ پر سر جھکانے والو اور سر کٹانے والو، دم واپسیں کلمہ کی خواہش پر مرنے والو کلمہ کے جاں نثارو! یہ وہی کلمہ ہے جس کی بنا رسول کے نواسہ کو قرار دیا ہے اور کسی ایسے ویسے نہیں، دانائے راز حقیقت حضرت معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں:۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسینؓ
دین است حسین دیں پناہ است حسینؓ

سرداد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؓ

عزیزو پیارے رسول کے نواسہ نے میدانِ کربلا میں اپنے خون سے لاالٰہ کی تفسیر تمام عالم کے سامنے پیش کردی ——— کہ کونسا الٰہ تھا جو معرکۂ کرب و بلا میں قربان نہ کر دیا گیا ہو ——— لاالٰہ کے معنی یہی ہیں کہ نہیں ہے کوئی الٰہ ——— الٰہ اصل میں کیا ہے — میرے پیارو اصل الٰہ ہماری خواہشات ہیں۔ جن کو کلام اللہ میں بار بار لفظ ہَوٰی سے تعبیر کیا گیا ہے ———

ولد ادۂ ہوا و ہوس ابن آدم سرگشتۂ خواہشات سدا اپنی نفسانی خواہشات کا بندہ بنا رہا۔ ان کا ایسا گرویدہ و شیدا ہوا کہ ہر چیز ان پر نثار کر دی یہی جذبہ اپنی انتہا کو پہنچ کر عبدیت کی حد تک آ گیا۔ یہ اشرف المخلوقات اس درجہ جھکا کہ نفس امارہ کے ساختہ پرداختہ بتوں کی پرستش کرنے لگا اور اسفل السافلین ہو گیا۔ اپنے ہاتھ سے اپنی خواہشات کے بت تراشے اور انہی کے آگے سجدہ ریز ہوا۔ یہ بلندیوں کا خواہاں، یہ پرواز کا عادی جب گرتا ہے تو اس کا گرنا بھی انتہا کا ہوتا ہے اس کا قدم جب بھی پھسلا خواہشات نفس کی کیچڑ میں پھسلا۔ اور یہ جب بھی دھنسا ہوا، کی دلدل میں دھنسا ——— دولت کی تمنا نے لکشمی اور سیمن کے بت ترشوائے، وہ انسان جس کی ٹھوکروں میں دولت ہے ان بتوں کے آگے سجدہ ریز ہوتا دیکھا گیا اور

دیکھا جاتا ہے ـــــ طلب حسن نے "وینس" کا مجسمہ ترشوایا۔ اور عقلائے یونان اس کے آگے سجدہ ریز ہوئے آسمان کے تارے توڑ کر لانے والے پتھر کے بت کے قدموں میں پجاری بن بیٹھے ـــــ طاقت کی آرزو نے "مہادیو" اور اپولو تیار کرلئے۔ یہ دیدہ ور صاحب نظر جب اندھا ہوتا ہے تو اس درجہ کہ جو بت اس کی چھینی اور ہتھوڑی تیار کرکے کھڑا کرتی ہے یہ اسی کے آگے بھینٹ چڑھاتا ہے انسان کی عقل پر جب خواہشات کے پتھر پڑتے ہیں تو پھر وہ یہ سب کچھ کرتا دیکھا جاتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک ـــــ جس شے سے اسے فائدہ پہونچا اسے دیوی دیوتا کا مقام دیا اور لگا پوجنے۔ گائے سے دودھ حاصل ہوا وہ ماتا بن گئی۔ لطف یہ کہ وہ تو ماں ہوگئی پھر بیل باپ نہ بنا۔ مطلب پرست اور مدعا جو عقل انسانی کا جواب نہیں۔ اتنی دور کی کوڑی لاتی ہے کہ جس کی نہ حد نہ حساب۔ اس بے زبان جانور کی مادہ تو اماں جان بن گئیں لیکن نر غریب کو والد بزرگوار بننا نصیب نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گائے سے تو صرف دودھ لینا مقصود ہے۔ اور وہ چمکار پچکار کر ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ اسوجہ سے قابل احترام و پرستش قرار دے دی گئی اس کے برخلاف بیل غریب سے ہل جُتوانے بھیلی اور رتھ کھچوانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام بغیر ڈنڈے برسائے نہیں لیا جاسکتا۔ اس کو اگر باپ بنا لیتے تو افادیت ختم ہوجاتی۔ باپ کے ساتھ یہ سب گستاخیاں کس طرح روا رکھی جاسکتی ہیں۔ دنیا کیا جہنم میں ٹھونکتی؟ پس اس بے چارہ کو محض بیل ہی رہنے دیا ـــــ سانپ کے ڈسنے سے ڈر لگا۔ اس کے زہر سے بچنے کی تمنا نے دل میں جنم لیا۔ سانپ مہاراج نے راجہ باسکھ کا روپ دھارا اور اشرف المخلوقات اس کے آگے ڈنڈوت کرنے ہو بیٹھا۔ جسے ایک ڈنڈا مار کر ختم کرسکتا تھا اس سے اس درجہ خائف ہوا کہ پوجنے لگا۔ ذلت انسانیت کی انتہا ہے ـــــ دریاؤں کی طغیانی سے ڈرے اس کے پانی سے کھیتیاں سینچیں۔ ان کے بھی پرستار بن بیٹھے۔ ـــــ زراعت کی ترقی سود رساں معلوم ہوئی چراگاہوں میں بھیڑ بکریاں پالیں۔ ڈیانا نے تخلیق پائی اور ہوا پرست ابن آدم اس کے آگے پرشاد چڑھانے لگا

بہر نوع و بہر کیف مدعا ہمارا یہ تھا کہ انسان نے اپنی خواہشات اپنی ہوائے نفسانی کے الٰہ تعمیر کئے اور انہیں پوجا ـــــ اسلام نے لا الٰہ کا نعرہ بلند کرکے ان سب کو یک قلم حرفِ غلط کی طرح لوح قلب سے محو کردیا۔ انسان کو اسباب پرستی کی پستی سے ابھار کر مسبب الاسباب کی طرف لے آیا ـــــ ابن آدم کو سب سے زیادہ رزق کی تلاش ہوتی ہے۔ اولین ضرورت اس ہی کی ہے قدرت نے زمین سے اناج اگایا۔ اور اس طرح چشم حق نگر کو اپنی زبان میں بتادیا کہ رزق اور اسباب رزق تم سے ارفع و اعلیٰ نہیں۔ یہ تو تمہارے قدموں میں ہیں۔ ان کی پرستش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تم تو کسی اور ہی کی عبدیت کے لئے پیدا کئے گئے ہو یہ سب تو تمہارے نوکر چاکر ہیں اور تمہارے قدموں سے لگے ہیں

سو بندہ نواز! ناجائز خواہشات کا رد لَا اِلٰہ کا مفہوم حقیقی ہے ـــــ اسلام میں رہبانیت نہیں:

اسلام آپ کی جائز خواہشات کو دباتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام تو دعوت دیتا ہے کہ اپنے جسم کے جائز حقوق ادا کرو اس کی ضروریات پوری کرو ـــــ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ردِ خواہشات کیا ہے ـــــ !

بندہ پرور، ایک جائز خواہشات ہیں ایک ناجائز۔ آپ کی جو خواہش حکم خداوندی کے اور آپ کے درمیان حائل ہو جائے وہ "الٰہ" ہے اور قابل رد۔ جو غنا عبد اور معبود کے درمیان دیوار ہے اسے ڈھانا "لا الٰہ" ہے۔ مثلاً اگر ایک وقت صاف و صریح حکم خدا ہے کہ میں اپنی اولاد کو جہاد پر بھیجوں اور اس وقت شفقت تعمیل حکم باری تعالیٰ میں حارج آئے تو وہ ہی شفقت جو بہترین جذبہ اور وجہ پرورش ہے الٰہ کا مقام لے لے گا۔ فرض کیجئے ایک روپیہ میری دسترس میں ہے لیکن حکم خدا اور رسول مانع۔ اگر میں روپیہ حاصل کر لیتا ہوں اس پر قبضہ کر لیتا ہوں تو یہ طلب زر الٰہ ہے اور "لا الٰہ" کے منافی مثال کے طور پر رب قدیر کا حکم ہے کہ سچی شہادت دوں خواہ وہ اپنی عزیز ترین ہستی کے خلاف ہو۔ اگر کسی وقت جذبۂ دوستی و اخوت مجھے اس سے روکتا ہے تو یہی جذبہ جو نہایت ارفع و اعلیٰ ہے اس محل پر الٰہ کہلائیگا۔

اسلام دین فطرت ہے یہ آپ کے جذبات اور آپ کی خواہشات کو نہیں کچلتا۔ وہ ان دھاروں کو صحیح راہوں پر ڈالتا ہے ـــــ جیساکہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ جذبات اور خواہشات بہت بڑی قوت ہیں۔ کسی قوت اور طاقت کو ختم کرنا قرین عقل نہیں۔ دین و مذہب کا کام اس کا صحیح استعمال سکھانا ہے سو اسلام آپ کی کسی قدرت کو دباتا نہیں۔ چونکہ آپ کی کوئی قوت اور طاقت بلا وجہ پیدا نہیں کی گئی اس کا ایک مصرف ہے ایک کام ہے اور ایک استعمال۔ آپ کے جذبات اور آپ کی فطری خواہشات ایک توی گھوڑے کی مانند ہیں اسلام ان کو پابہ جولاں نہیں کرتا لا الٰہ کے ذریعہ ان کی تربیت کرتا اور خوش خرام بناتا ہے امر و نہی کی لگام سے اس کو صحیح راہ پر چلاتا ہے۔

لا الٰہ آپ کے کردار اور آپ کی زندگی پر یہ اثر کرتا ہے کہ آپ جو بھی قدم اٹھائیں اس میں یہ امر ہمہ وقت مدنظر رہے کہ حکم خدا کے مطابق ہے یا نہیں اگر ہے تو مبارک ہو اور اگر نہیں ہے تو یہ سمجھئے کہ کوئی نہ کوئی خواہش بہ شکل الٰہ درمیان میں حائل ہے۔

یہ ہے وہ لا الٰہ جس سے اغیار محروم ہیں اور تم مالامال

اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس سے کام لو یا نہ لو بہر صورت یہ

دولت تمہارے پاس موجود ضرور ہے

اچھا حضور، خدا حافظ۔ انشاء اللہ پھر باتیں ہوں گی

(بقیہ تقلید کے بارے میں) پر حنفیہ نے عمل کیا ہے۔ وہ ان کے اصول پر صحیح تھی گو محدثین کے نزدیک ضعیف ہو۔ حنفیہ کے نزدیک صحت حدیث کا مدار صرف سند پر نہیں بلکہ اس کے لئے کچھ اور بھی شرائط ہیں جو اصول فقہ میں مذکور ہیں اور ہم نے مقدمۂ اعلاء السنن میں بھی ان کو بیان کر دیا ہے اور مقدمۂ اعلاء السنن کے دوسرے حصہ میں تقلید و اجتہاد پر مفصل کلام کیا گیا ہے جو زیر طبع ہے۔ شاگرد:۔ الحمد للہ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں اور میں اہلحدیث کے مغالطے سے نکل گیا ہوں۔ والحمد للہ رب العٰلمین۔

جناب محمد حفیظ اللہ پھلواروی

اسلامی مساوات

آپ صفحۂ ہستی پر نظر ڈالیں اور حوادثِ عالم کا مطالعہ کریں، انقلابِ امم کے مسئلہ پر غور کریں، اقوام کے ارتقاء اور تنزل کے اسباب کی تلاش کریں، تو یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ وہ اسباب جو اُن کی ترقی کے وقت تھے وہ ان میں تنزل اور انحطاط کے وقت باقی نہ رہے، جن اصول پر اُن اقوام کے اسلاف عامل تھے، اور اُن کو اپنا مایۂ افتخار سمجھتے تھے ان کے اخلاف نے چھوڑ دیا، اور ان ہی باتوں میں کسرِ شان سمجھنے لگے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ارتقاء کے عوض تنزل ہوا، آفتابِ اقبال کے بجائے ظلمت کدۂ ادبار آئے، اور ہدایت کی روشنی کی جگہ ضلالت و گمراہی کی تاریکی ظاہر ہوئی،

انھیں اصولِ مسلمہ کے مطابق مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب پر غور کرو،

جب مسلمانوں میں باہمی افتراق نہ تھا، نسلی امتیاز نہ تھا، عربی و عجمی کا جھگڑا نہ تھا، مناطِ فضل ذاتی جوہر تھا شرافت کوئی میراث آبائی نہ تھی، مدار بزرگی علم و تقویٰ تھا نہ کہ محض خاندان و نسب، اُن کا دستورِ عمل قرآن کریم کی یہ منادی تھی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ
وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ
لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے ہیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔"

اُس وقت مسلمانوں کی اقبال مندی کا آفتاب سارے عالم کو اپنی شعاعوں سے منوّر کر رہا تھا، اُن کی شوکت و تمکنت اور سطوت و ہیبت کا ڈنکا بج رہا تھا، اُن کا تمدّن تمام جہان کے تمدّن سے فائق تھا، اُن کی تہذیب ساری دنیا کی تہذیب سے بہتر تھی، اُن کی حکومتیں راست بازی، عدالت، قانون پر مبنی تھیں، اُن کی انتظامی قابلیت اور حکمرانی کی لیاقت مشہور و مسلّم تھی، اور ان کے اخلاق و شمائل بہترین سمجھے جاتے تھے،

دیکھو! مندرجہ بالا آیت مقدسہ اور دینِ فطرت کے اعلان عام میں دنیا کے ناطے اور رشتے پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے پروردگارِ عالم اس یک جہتی اور یگانگت کا تذکرہ فرماتا ہے جس کی رُو سے تمام بنی نوعِ انسان ایک ہیں، اس آیت سے دو باتیں متشرح ہوتی ہیں، ایک تو خاندانی عظمت، دوسرے اُن کا باہمی فرق، اور جداگانہ تشخص، معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں امور ضروری ہیں، لیکن تمام خاندان اور کنبہ کی تعریف اللہ تعالیٰ نے مختصر الفاظ میں اس طور پر فرمادی کہ تم سب کو ہم نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا،

یعنی تمہارے خاندان کو جس قدر بھی وسعت ہو، تمہاری نسلیں جس قدر بھی پھیلیں، اور تمہارے رشتے جتنے بھی وسیع ہوں سب دراصل ایک باپ اور ایک ماں سے پیدا ہیں، اور سب کی اصل اور سب کا مرجع ایک مرد اور ایک عورت ہے، اسلام حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہونیکی وجہ سے کسی کو کسی پر برتری اور فوقیت نہیں دیتا ہے،

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں ؎

اَلنَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَاءُ
اَبُوْهُمْ اٰدَمُ وَالْاُمُّ حَوَّاءُ

"تمام دنیا کے آدمی باعتبار ایک دوسرے کے
ہمسر ہیں، (کیونکہ) سب کے باپ آدم اور ماں حوا ہیں"

اصل سب کی ایک ہے، یہ سارے خاندان اور دنیا کی مختلف قومیں اور نسلیں اُس اصل کی شاخیں ہیں، لیکن کس قدر حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ خداوندِ عالم کے اس فرمانِ عالی شان کے صریح اور صاف ہونے پر بھی لوگ اپنی اصل سے بے خبر ہو کر قومی تشخص اور نسلی امتیاز کو اس حد تک برتنے لگے ہیں کہ ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئے ہیں، اور وہ باہمی یک جہتی اور ہمدردی جو ساری ترقیوں کا راز ہے مفقود ہو گئی،

حضرت سعدیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

"جملہ بنی آدم گویا آپس میں ایک دوسرے کے
اعضا ہیں اس لئے کہ وہ پیدائش میں ایک جوہر سے ہیں"

لیکن یہاں ان باتوں کو محو و سہو کر کے خاندانی ناز و افتخار کا کلمہ پڑھا جانے لگا، اور غرور و نخوت اس حد تک پہنچ گئی کہ معاذ اللہ یہ تو معلوم ہی نہیں ہوتا، کہ یہ دونوں متفاوت المراتب گروہ ایک ہی آدم کی اولاد ہیں،

لطیفہ ہے کہ ایک صاحب اپنے خاندان کی تعریف اس طور پر کر رہے تھے کہ گویا دنیا میں کوئی اس صفت کا خاندان نہ ہوا ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، ایک نوجوان جو بڑا حاضر جواب تھا، مخاطب ہوا، اور پوچھا:

"حضرت: آپ کس کی اولاد سے ہیں؟"

انھوں نے اپنے خاندان کے بزرگ کا نام بتایا، اس کے بعد اُن بزرگ نے جوان سے دریافت کیا:

"آپ کس خاندان سے ہیں؟"

نوجوان نے جواب دیا:

"میں آدم علیہ السلام کے بھائی کی اولاد سے ہوں"

انھوں نے تعجب سے دریافت کیا کہ:

"حضرت آدم علیہ السلام کے بھائی کون تھے؟"

اس پر نوجوان نے طیش میں آکر کہا:

"جب حضرت آدم علیہ السلام کے کوئی بھائی نہ تھے اور سب ایک ہی نسل سے ہیں، تو یہ غرور کیوں، کہ میں فلاں کی اولاد سے ہوں"

سب ایک ہی آدم و حوا کی اولاد سے ہونے کے باوجود بھائی چارہ اتنا بھلا دیا گیا کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کو "ذلیل" اور "کمینہ" کہتا ہے، اور بعض جگہ تو ایک بھائی دوسرے بھائی کو چھونا تو کہاں اس کا سایہ پڑنا بھی گوارا نہیں کر سکتا،

مختلف قوموں اور نسلوں اور مذہبوں میں ایک اخوت کا رشتہ قائم کرا دینا اسلام سے پیشتر دنیا میں کہیں نہیں دیکھا گیا، اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے نسلی اور قومی تفریق کو مٹا کر سب کو دائرۂ اسلام میں داخل کر کے بھائی بھائی بنا دیا،

اسلام دنیا میں مساوات کا سب سے بڑا علمبردار ہے، اس لئے اسلام نے جلوہ گر ہونے کے بعد رنگ، نسل کے تمام امتیازات کو ختم کر دیا، اور تمام انسانوں کو خواہ وہ شاہ ہوں یا گدا، ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کر دیا،

درحقیقت اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ذات پات کی قید روا نہیں رکھی، اسلام کا قانون ہے کہ کل بنی آدم خواہ امیر ہوں یا غریب، قوی ہوں یا کمزور، گورے ہوں یا کالے سب برابر ہیں، اور تمام انسان یکساں حقوق رکھتے ہیں، پیدائشی طور پر کسی انسان کو دوسرے انسان پر محض خاندان یا قوم کی وجہ سے کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں، بلکہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فرما کر دین کے جملہ مومنوں کو خواہ وہ کہیں کے ہوں، کیسے ہی ہوں سب کو بھائی بھائی قرار دیا،

خدائے تعالیٰ نے اپنے احکام کی تعمیل میں کُل لوگوں کو چاہے وہ کسی خاندان سے ہوں مساوی رکھا ہے، مذہب اسلام نے اپنے ارکان میں جن پر اسلام کا دارومدار ہے مساوات کی تعلیم دی ہے، یا یوں سمجھو کہ بنا ہی اس کی مساوات پر رکھی گئی ہے، دیکھو! نماز کے وقت ایک ہی صف میں بادشاہ، امیر، کبیر، غریب، فقیر، عالم فاضل جاہل سب مل جل کر کندھے سے کندھا ملا کر برابر کھڑے ہوتے ہیں، ایک بادشاہ کی بھی یہ مجال نہیں کہ فقیر و مفلس کو الگ کر دے، یا اس سے ایک قدم بڑھ کر کھڑا ہو، سب ایک طور ہے، ایک حالت سے، ایک ادا سے کھڑے ہوتے ہیں، کسی پر کسی کو فوقیت نہیں، اسی واسطے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار ارشاد فرماتے تھے،

سَوُّوْا صُفُوْفَکُمْ فَاِنَّ تَسْوِیَۃَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ (بخاری)

صفوں کو برابر رکھو، کیونکہ اقامتِ صلوٰۃ میں صفوں کی مساوات اور برابری بھی شامل ہے"

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

حج میں اطرافِ عالم سے لوگ آ کر ایک مرکز میں جمع ہوتے ہیں، بادشاہ، امیر، غریب، فقیر، ہر رنگ، ہر مذاق، ہر ملک، ہر عہدہ، اور ہر منصب کے لوگ ایک ہی طرز کا لباس پہنے ہوئے حالتِ احرام میں نظر آتے ہیں اور مساوات کی حقیقی تصویر سامنے آجاتی ہے،

اسی طرح پر روزہ ہے کہ راجا پرجا، امیر غریب، ایک ہی طور پر بھوکے پیاسے رہتے ہیں، کسی امیر پر امارت کی وجہ سے روزہ معاف نہیں ہو سکتا، نہ کسی بادشاہ کو بادشاہت اُس کو اس بھوک پیاس سے روک سکتی ہے،

غرض اسلام کے ارکان میں مساوات کی تعلیم موجود ہے، دربارِ خداوندی میں قوت یا عالی خاندانی کوئی کام نہیں آتی، ہاں، وہاں بھی لوگوں کو فوقیت ہے، مگر کن لوگوں کو؟ اُن لوگوں کو نہیں جو اپنے کو عالی خاندان کے افراد سمجھتے ہیں، وہاں فوقیت اُن لوگوں کو دی جائے گی... جو پرہیزگار ہیں، اور جو خدا اور اس کے رسول کی باتوں پر عمل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم میں سب سے زیادہ مقرب بارگاہِ الٰہی میں وہی ہو گا جو زیادہ متقی ہوگا، صرف نسب بغیر عمل صالح وہاں کوئی کام نہیں آئے گا،

تقرب کی ہے اگر خواہش تو کچھ اعمال صالح کر
وہاں مذہب کے جھگڑے ہیں نہ قومیں ہیں نہ ذاتیں ہیں

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ،

"یعنی قیامت کے دن جب صُور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ آپس کی رشتہ داریاں باقی رہیں گی نہ لوگ ایک دوسرے کی بات پوچھیں گے"

حشر کے دن ذات پات کا علاقہ جاتا رہے گا، ایک کو دوسرے کا کچھ لحاظ نہ ہو گا، اور نہ کسی کو کسی کا کچھ علم ہوگا ہر شخص کو اپنی اپنی فکر ہو گی،

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرماتا ہے:-

لَنْ تَنْفَعَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ

يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

"یعنی قیامت کے دن ہرگز نہ تمہاری رشتہ داریاں فائدہ پہنچائیں گی اور نہ تمہاری اولاد، تمہارے درمیان جدائی رہے گی، اور اللہ جو کچھ تم کررہے ہو اس سے بہت باخبر ہے۔"

اسلام کا فیضان صرف قریش ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ہمارے آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے رحمت بناکر بھیجے گئے تھے، وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ اسلام کی رحمت بڑے بڑے خاندانوں تک محدود رہ جاتی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یہ خوب جان لو کہ قیامت کے دن میرے عزیز وہی لوگ ہوں گے جو دنیا میں خدا سے ڈرتے ہیں، اور تم باوجود اس رشتہ داری کے میرے عزیز نہیں ہوگے، لوگ میرے پاس نیکیاں لے کر آئیں گے، اور تم اپنے سروں پر دنیا کا بوجھ اٹھاکر لاؤ گے، پھر میرا نام لے کر بار بار پکاروگے، تم کہوگے کہ اے محمدؐ! ہم فلاں کے بیٹے ہیں، میں کہونگا کہ تمہارا خاندان تو معلوم ہوا، مگر تمہارے اعمال کہاں ہیں؟ جب تم نے خدا کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا تو اب جاؤ، میرے اور تمہارے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔

صوبہ بہار کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ؎

شرفا گور بھیاونی اور نت اندھیاری رات
وہاں نہ پوچھے کوئی بھی کہ کیا تمہاری جات

اور ایک دوسرے بزرگ کا قول ہے:

جات پات نہ پوچھے کوئی
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئی

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلْكَرَمُ التَّقْوٰى

"بزرگی اور بڑائی خوف، تقویٰ و حسنِ عمل ہے۔"

لَيْسَ لِاَحَدٍ عَلٰى اَحَدٍ فَضْلٌ اِلَّا بِالدِّيْنِ وَتَقْوٰى (مشکوٰۃ)

"کسی کو ایک دوسرے پر فضیلت نہیں، اگر ہے تو دین اور تقویٰ سے ہے۔"

حرمتِ نفس و مساوات و اخوت عدل و رحم
چشمۂ توحید سے یہ پنج دریا ہیں روا

"عرب کے کسی باشندے کو عجم کے باشندے پر اور عجم کے کسی شخص کو عرب کے کسی شخص پر گورے رنگ والے کو کالے آدمی پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، فضیلت کا ذریعہ تو صرف تقویٰ ہے۔" (زاد المعاد)

اسلامی اصول کے تحت کالے کو گورے سے، غلام کو آ سے، غریب کو امیر سے، عربی کو عجمی سے کمتر نہیں کیا جا کسی پر کسی کو فوقیت نہیں،

اگر کوئی غریب فرقہ ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ خدا کے آگے بھی غریب ہے، نہیں نہیں وہ اس ناچیز اور فانی دنیا میں اگرچہ غریب ہے، اور ظا صورت نفرت دلانے والی ہے، اس کا لباس بھی معمولی اس کی غذا پلاؤ اور قورمہ نہیں، مگر یاد رکھو کہ اللہ تعا کے دربار میں اس کا رتبہ بہت بڑا ہو سک ہے ؎

فقر ظاہر مبیں کہ حافظ را
سینہ گنجینۂ محبتِ اوست

"حافظ کے ظاہری فقر کو نہ دیکھ، کہ سینہ
اس کی محبت کا خزانہ ہے"

غرض ذات پات کوئی چیز نہیں، اصلی وقار علم و اخلاق اور تقویٰ ہے،

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

"جامی تو بندۂ عشق ہوگیا تو ترکِ نسب کر، کہ اس
راستے میں فلاں ابن فلاں کی کوئی حقیقت نہیں"

یعنی عشق و محبت کرنے والے کو نسبی فضیلت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا،

اسلام نے ایک انسان کو دوسرے انسان پر حسب نسب اور قومیت کی برتری کو ختم کرکے تقویٰ کو انسانی عظمت کا معیار قرار دیا،

ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ آدمیوں (غلاموں) کے ساتھ بھیڑ بکریوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا، کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت اُن غلاموں کی کیا حالت تھی، اُن کو کس طرح تکلیفیں دی جاتی تھیں، صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اُن کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا، اسلام کے ظہور کے وقت غلامی کا رواج انسانی سماج کا عالمگیر رواج تھا، اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے اس کی اصلاح کی کوشش کی،

حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کا اعلان کرکے غلاموں کی حالت بدلنے کی کوشش کی، طرح طرح کے طریقے انھیں آزاد کرنے کے نکالے، مثلاً قسم و روزہ کے کفاروں میں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے بارے میں حکم دیا کہ:

"جو تم کھاتے ہو وہی ان کو کھلاؤ، جیسا تم پہنتے ہو ویسا ہی انھیں پہناؤ، اگر وہ قصور کریں تو (اگر معاف نہیں کرسکتے) تو فروخت کردو، کیونکہ وہ خدا کے بندے ہیں، اور انھیں ایذا نہیں دینی چاہئے، یاد رکھو! تم سب بھائی بھائی ہو، تم سب مساوی ہو"

یہ اعلان اس وقت کا ہے جب مغرب والوں کو ان باتوں کا خیال بھی نہیں تھا،

قیامت کے دن آقا اور غلام دونوں ایک ہی صف میں دست بستہ کھڑے ہوں گے، وہاں نہ آقا دیکھا جائے گا اور نہ غلام، بلکہ بعض حالتوں میں غلام کا درجہ آقا سے کہیں زیادہ ہوگا، حِبِّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آنحضرتؐ کے محبوب حضرت زیدؓ نے سب سے پہلے تصدیق رسالتؐ کی، امام زہریؒ کی روایت ہے کہ:

ما علمنا احدا اسلم قبل زید بن حارثہ

"ہم کو نہیں معلوم کہ حضرت زیدؓ سے پہلے کوئی اور اسلام لایا ہو"

قرآن میں کسی صحابی کا نام مذکور نہیں، لیکن حضرت زیدؓ[1] کا ہے، پہلا سپہ سالار لشکرِ اسلام جو آنحضرتؐ نے رومیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا حضرت زیدؓ تھے، اور آپ کے ماتحت معزز صحابی اور رسولؐ کے چچازاد بھائی جعفرؓ اور خالد بن ولیدؓ تھے، ...... مورخین کی رائے ہے کہ اگر حضرت زیدؓ زندہ رہتے تو غالباً وہی خلیفۂ اوّل ہوتے (خلافتِ اسلامیہ)[2]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کا ہاتھ پکڑ کر اعلان فرمایا تھا،

"اے وہ لوگو جو اس وقت موجود ہو تم سب گواہ رہو کہ زید میرا فرزند ہے"

---

[1] فلما قضیٰ زید، [2] غلامانِ اسلام،

حضرت عائشہ رضؓ کا قول مشہور ہے:

لوکان زید حیا ما استخلف رسول اللہ غیرہ،

"اگر آنحضرتؐ کے غلام زیدؓ زندہ رہتے تو آپؐ اُنکے سوا کسی کو اپنا جانشین نہ بناتے۔"

یہ ہے ایک درجہ ایک غلام کا اسلام میں،

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ اور حضرت اُسامہؓ کی موجودگی میں فرمایا:

"میرے اہل میں مجھ کو سب سے زیادہ وہ شخص محبوب ہے جس پر خدا نے اپنا انعام وفضل کیا ہے، اور میں نے بھی اس پر انعام واحسان کیا ہے، اور وہ اُسامہ بن زید ہے، علیؓ وعباسؓ نے عرض کیا: اور اُسامہ کے بعد؟ آپ نے فرمایا پھر علی بن ابی طالب، حضرت عباسؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ آپنے اپنے چچا کو اپنے اہلِ بیت میں آخر میں رکھا، آپنے فرمایا: علی نے ہجرت میں تم پر سبقت کی ہے" (ترمذی)

اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ مجھ کو اور حسنؓ کو پکڑ کر فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی ان کو محبوب فرما، (بخاری)

مسلمان اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ مثل اولاد کے سلوک کیا کرتے تھے، یہاں آزادی اور مساوات کے فرضی افسانے نہ تھے، بلکہ حقیقی معنی میں آقا اور غلاموں میں ہمسری اور مساوات تھی، دراصل یہ اسلام کی واضح ترین خصوصیت ہے کہ اس کی نظر میں آقا اور غلام کا ایک مرتبہ ہے نہ اُن میں کوئی تفاوت ہے نہ امتیاز، کلام اللہ کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے مسلمان بھائی بھائی ہیں، صرف ایک ہی چیز ہے جس سے انسان کی باہمی رتبوں میں تفریق ہوسکتی ہے، یعنی تقویٰ اور حسنِ عمل،

ایک بار ایک صحابی اپنے غلام کو مار رہے تھے، رحمۃ اللعٰلمین نے فرمایا: "یہ تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اختیار میں دیدیا ہے، جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ جو خود پہنو ان کو پہناؤ۔"

یہ مساوات کا ہی کرشمہ تھا کہ سیدنا حضرت بلال رضی اللہ عنہ ایک حبشی غلام تھے، لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی بزرگی کا لحاظ کرکے فرماتے:

بلال سیدنا ومولیٰ سیدنا،

"یعنی بلال ہمارے آقا ہیں اور ہمارے آقا کے غلام ہیں"

آج تیرہ سو سال گزر گئے، مگر مسلمانوں کے دلوں میں جیسی عزت اور احترام اس غلام کی ہے، وہ اظہر من الشمس ہے، اور ہر مسلمان دیندار آپ کا غلام بننا فخر سمجھتا ہے،

فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں تو بعض لوگ حضرت بلالؓ کے نسب پر طعنہ زن ہو کر کہنے لگے کہ کیا حضورؐ کو اس کوے کے سوا اور کوئی شخص نہیں ملا تھا کہ اذان کے لئے اس کو چڑھا دیا!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ملی تو آپ نے فرمایا:

"اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے اور حق کے ساتھ تم پر حکومت کرے تو اس کی تابعداری کرو۔"

ایک دفعہ مجلسِ نبویؐ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منہ سے اچانک نکل گیا کہ "اے بلال! تم حبشی سیاہ رنگ ہو"

یہ سُنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عمر! تم میں اس وقت تک جاہلیت کی بو باقی ہے۔" حضرت عمرؓ زمین پر گر پڑے، اور جب اٹھنے کا حکم ہوا تو آپ نے کہا "جب تک بلال اپنے پیر سے ٹیک دے کر نہ اٹھائیں گے میں نہیں اٹھوں گا" اور اس پر اتنا اصرار کیا کہ حضرت بلالؓ

ایسا ہی کرنا پڑا،

کبھی کسی کو عذر نہ ہوا، کہ اپنی لڑکیوں کی شادی نومسلم غلاموں سے کر دیں، یہی لوگ اسلام سے قبل ایک قبیلہ کی لڑکی کی شادی دوسرے قبیلہ کے لڑکے سے کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتے تھے، لیکن اسلام کی تعلیم نے ان تمام بے جا قیود کو اٹھا دیا،

شبلیؒ فرماتے ہیں:

یا یہ حالت تھی کہ تلوار بھی تھی طالب کفو
یا مساواتِ مسلمان کا پھیلا یہ اثر
بارگاہِ نبویؐ کے جو مؤذن تھے بلالؓ
کرچکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر
جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں
جا کر انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر
ہیں غلام حبشی اور حبشی زادہ بھی ہوں
یہ بھی سن لو کہ میرے پاس نہیں دولت و زر
ان فضائل پہ مجھے خواہش تزویج بھی ہو
ہے کوئی جس کو نہ ہو میری قرابت سے حذر
گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ دل سے منظور
جس طرف اس حبشی زادہ کی اٹھتی تھی نظر

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے بھائی نے ایک عرب خاتون کو پیغام عقد دیا، خاتون کے خاندان والوں نے کہا کہ اگر بلالؓ تصدیق کر دیں تو ہمیں یہ نسبت منظور ہے، حضرت بلالؓ نے تصدیق کر دی کہ "میرا بھائی ہے" ان لوگوں نے کہا "بلال! تم جس کے بھائی ہو گے اس سے شادی کرنے میں ہمارے لئے کوئی عار نہیں"

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر افسوس کیا ؎

عہدِ فاروقی میں جس دن کہ ہوئی انکی وفات
یہ کہا حضرت فاروقؓ نے با دیدۂ تر
اٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا
اُٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر
اس مساوات پہ ہے معشرِ اسلام کو ناز
نہ کہ یورپ کی مساوات کہ ظلمِ اکبر

صہیب رومیؓ، سلمان فارسیؓ، خباب بن الارتؓ، عمارؓ وغیرہ جو آزاد شدہ غلام تھے، اور جن کے نام سردارانِ قریش کے پہلو بہ پہلو ہیں، ان کے متعلق ہم کیا جانتے ہیں؟ ان کے خاندان کا ہمیں کیا پتہ ہے؟ ہم صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ مسلمان تھے اور بس، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ نعوذ باللہ ذرہ برابر بھی نفرت یا حقارت سے دیکھا گیا ہو،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت صہیب رومیؓ کو دیکھتے تو فرماتے: نعم العبد صھیب لو لم یخف اللہ لم یعصہ "صہیب اللہ کا نیک بندہ ہے، اگر خوف عذاب نہ ہوتا تب بھی اس کی فطرت بدی پر مائل نہ ہوتی"

حضرت سلمان فارسیؓ غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اپنا نقیب فرمایا، آپ نے فرمایا:

"سلمان ہمارے اہلِ بیت میں ہے"

نیز آپ نے فرمایا:

"علیؓ، عمارؓ، اور سلمانؓ ان تینوں آدمیوں کی جنت مشتاق ہے"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

"سلمان تو ہم اہلِ بیت میں سے ہیں"

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں:

"سلمانؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ قربت حاصل تھی کہ قریب تھا کہ وہ ہم لوگوں پر غالب آجائیں"

(باقی آئندہ)

قرآن محل کراچی کی قابل قدر اور نظر افروز مطبوعات

نور افزا قرآن مجید دو ترجمہ والا

ترجمہ اول:- شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ترجمہ دوم حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ مع حاشیہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، ہدیہ:- قسم اول -/۲۵ قسم دوم -/۱۵ قسم سوم ...

اس کے علاوہ ہر قسم کے مترجم و معریٰ قرآن مجید مختلف سائزوں میں جن کی صحت علمائے کرام نے فرمائی ہے۔ ہم سے طلب فرمائیں۔

کتب احادیث نبویؐ کا انمول ذخیرہ

کتاب	جلد	قیمت
بخاری شریف مترجم عربی اردو کامل	۳ جلد	۵۶/۲۵
مسلم شریف مترجم عربی اردو کامل	۳ جلد	۵۶/۲۵
ترمذی شریف مترجم عربی اردو کامل	۲ جلد	-/۳۶
سنن ابو داؤد شریف مترجم عربی اردو کامل	۳ جلد	-/۴۵
سنن نسائی مترجم اردو کامل		۴۰/۵۰
مشکوٰۃ شریف مترجم عربی اردو کامل	۳ جلد	۳۳/۷۵
ریاض الصالحین مترجم عربی اردو کامل	۲ جلد	-/۲۴
مسند امام اعظم مترجم عربی اردو	مجلد	۱۰/۵۰
موطا امام محمد مترجم عربی اردو	مجلد	۱۰/۵۰
کتاب الآثار مترجم عربی اردو	مجلد	۱۰/۵۰
انتخاب صحاح ستہ مترجم عربی اردو	مجلد	۶/۷۵
تجرید صحیح بخاری شریف اردو	مجلد	۱۰/۵۰
سنن دارمی شریف اردو	مجلد	-/۱۲
موضوعات کبیر مترجم عربی اردو	مجلد	-/۸
نماز حنفی مکمل مدلل	مجلد	-/۳

کتب اصول تفسیر، حدیث، فقہ و تاریخ

کتاب	جلد	قیمت
الفوز الکبیر فی اصول تفسیر مع فتح الخبیر مترجم عربی، فارسی، اردو از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	مجلد	۷/۵۰
اصول تفسیر اردو، مولانا محمد مالک	مجلد	۷/۵۰
اصول حدیث اردو، مفتی امجد العلی	مجلد	۷/۵۰
اصول فقہ اردو، مولانا حبیب الرحمٰن		۷/۵۰
بہشتی زیور کامل دو جلد مجلد، قسم اول -/۱۸ قسم دوم		-/۱۲
فتاویٰ مولانا عبد الحی کامل	مجلد	-/۱۵
احسن المسائل ترجمہ اردو کنز الدقائق	مجلد	-/۸
فتاویٰ رشیدیہ کامل		۱۰/۵۰
احسن الفتاویٰ کامل		۱۳/۵۰
ازالۃ الخفاء اردو کامل	۲ جلد	-/۲۷
احکام السلطانیہ اردو کامل	مجلد	-/۶
معرفت الہیہ کامل	مجلد	-/۹
مفتاح اللغات عربی اردو ڈکشنری	مجلد	-/۱۰
لغات القرآن کامل	مجلد	۷/۵۰

درس نظامی کی جملہ کتب

کتاب	قیمت
ابواب الصرف جدید	۱/۵۰
اصول الشاشی	۳/۳۷
انوار العلوم شرح سلم العلوم اردو	-/۴
ایضاح العوامل شرح مأتہ عامل	۲/۲۵
ایضاح المطالب شرح اردو کافیہ	-/۳
بوستان محشی فارسی	۲/۳۷
تاسیس النظر عربی	۱/۶۸
ترمذی شریف عربی جلد اول	۱۰/۵۰
ترمذی شریف عربی جلد دوم	-/۱۱
ترمذی عربی کامل مع شمائل و تقریر ترمذی	-/۲۵
تلخیص المفتاح محشی	۱/۵۰

کتاب	قیمت
تفسیر بیضاوی عربی	۷/۵۰
حسامی شرح نظامی	-/۶
دروس البلاغہ مع شرح اردو	-/۳
دیوان علی محشی	۲/۶۲
دیوان متنبی محشی	۴/۵۰
سبعہ معلقہ محشی	۱/۱۲
سبیل الاقوم ترجمہ مسلم الثبوت	۱/۵۰
سراجی محشی کلاں	۲/۲۵
شرح تہذیب محشی	۲/۲۵
شرح عقائد	۳/۷۵
شرح فقہ اکبر	۲/۱۲
شرح وقایہ کامل	-/۱۸

کتاب	قیمت
شریفیہ شرح سراجی	۲/۱۲
علم الصیغہ	۱/۵۰
کنز الدقائق محشی کلاں	۱۲/۷۵
کشف المبہم شرح مسلم الثبوت	۴/۵۰
مختصر المعانی محشی شیخ الہندؒ	۱۰/۵۰
مراح الارواح	۱/۵۰
مرقات مع شرح مرآت	-/۱
مسلم الثبوت محشی	۱/۴۰
مشکوٰۃ عربی، گلیز -/۲۰ رف	-/۱۵
مشکوٰۃ عربی مصری	-/۱۸
مصباح اللواشی	۳/۵۰
مطول محشی	۳/۵۰

کتاب	قیمت
مقامات حریری	۳/۷۵
سلم الحسن	-/۳
منیۃ المصلی محشی	-/۲
میبذی محشی	۷/۵۰
میبذی عین القضاۃ	-/۴۰
نحو میر محشی	-/۱
نخبۃ الفکر مع شرح نزہۃ النظر	۲/۲۵
نشاط الارواح شرح اردو نور الایضاح	-/۳
نفحۃ العرب محشی	۶/۵۰

ان کے علاوہ جملہ کتب درس نظامی موجود ہیں ہم سے طلب فرمائیں

(مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں، آپ کی فرمائش پر ہماری خدمات آپ کے لئے وقف ہو جائیں گی۔)

جناب احمد عبداللہ المسدوسی

قضیۂ فلسطین اور اسرائیل کی جنگ

۵

یہ اس مقالے کی آخری قسط ہے، اس میں فاضل مقالہ نگار نے بعض نہایت اہم باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو عام چلے ہوئے نعروں سے ہٹ کر سوچی گئی ہیں، یہ باتیں آپ کو اچنبھی محسوس ہوں گی، لیکن ساتھ ہی فکر انگیز بھی، ان پر نہایت ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت ہے۔　ادارہ

چونکہ اسرائیل کا قضیہ اصلاً عرب علاقے میں واقع ہے، اس لئے اس سے نمٹنے کی اولین ضرورت یہ ہے کہ عرب ممالک باہم متحد ہوں، عرب ممالک کے اتحاد کی ضرورت کا خیال کوئی نیا خیال نہیں ہے، شریف حسین سے لے کر جون کے سانحے تک عربوں میں یہ خیال عام رہا ہے، اس لئے عرب لیگ کا ادارہ قائم ہوا۔ عربوں کے اتحاد کے لئے جتنی موافق قوتیں موجود ہیں، شاید ہی کسی اور قوم کے اتحاد کے لئے اتنے قوی عناصر موجود ہوں، محیط سے لے کر خلیج تک کی آبادی کا نوے فی صد سے زائد حصہ اسلام کے مشترکہ مذہب سے مربوط ہے، اس مذہبی داعیے کے علاوہ عہد حاضر میں کسی قوم کے اتحاد کے جو اسباب سمجھے جاتے ہیں۔

مثلاً زبان اور نسل، وہ بھی ان کے مؤید ہیں۔

ایشیاء کے عرب ممالک کو چھوڑ کر افریقہ کے عرب ممالک کی اکثریت بھی عربی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کے مستند اور غیر جانبدار حوالے ہماری کتاب "افریقہ ایک چیلنج" میں دیئے گئے۔

پھر اس پورے خطے کی زبان مشترک اور عربی ہے۔ اس لئے ان روحانی اور سیاسی عوامل کے تحت رباط سے کویت تک کے علاقے کی عرب آبادی میں اتحاد کا ایسا زبردست داعیہ موجود ہے جس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی خطے میں پائی جاتی ہے۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان قوتوں کے سہارے کے باوجود عرب اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر

نہیں ہوسکا۔ ہماری دانست میں اس کے چند بنیادی اسباب ہیں جن کو دور کرنا عربوں کے باہمی اتحاد اور ان کے مسائل کے حل کے لئے ناگزیر ہے۔

اتحاد کا غلط مفہوم:

(۱) اس علاقے میں مغربی استعمار کے رخصت ہونے کے بعد جو سیاسی وحدتیں بنیں وہ مختلف نظام حکومت کے تابع ہیں، کہیں جمہوریت ہے اور کہیں شاہی، اور ان کی بھی مختلف شکلیں ہیں، اگر ہم پچھلے دور میں عرب اقوام کی سیاست کاری کے بارے میں ہمدردانہ نقطۂ نظر ا لیں، اور کسی کو مطعون کرنے سے پرہیز کریں تو اتنی بات صاف ہے کہ غیر ضروری طور پر دستوری اختلافات کو عرب اتحاد کے منافی سمجھا گیا، اور یہ غلط فہمی رہی کہ بغیر اس پورے علاقے میں ایک قسم کے طرز حکومت یا ایک مشترکہ اقتدار کے ملت عربیہ کا بھرپور ارتقاء نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ نہ یہ عربوں کے لئے ضروری ہے اور نہ دنیا کے کسی اور خطے یا آبادیوں کے لئے۔ مثلاً یورپ کو لیجئے، جو ظاہر بینوں کے نزدیک نام نہاد جمہوریت کا گہوارہ ہے، کیا یورپ کی تمام سلطنتیں یکساں دستور کی پابند ہیں؟ کیا وہاں شاہیاں نہیں ہیں؟ اور کیا گذشتہ دو صدیوں میں دستور کے اختلافات اور شاہیوں کی موجودگی میں یورپ نے دنیا پر حکومت نہیں کی؟ کیا پچھلی صدیوں میں یورپ کے دنیا پر راج کے لئے یورپ کے مختلف ممالک کی انفرادیت اور قومی شخصیت کو ختم کرنا ضروری ہوا؟ ایسا نہیں ہے تو یورپ کا تجربہ ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ مختلف سیاسی طور پر آزاد اور خود مختار اکائیوں کا باقی رہنا قومی مفادات کے خلاف ہے، اور نہ بادشاہوں کا عروج۔

یورپ کی پچھلی دو صدی کی تاریخ کی روشنی میں تو یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ ترقی، ٹھیراؤ اور تنزل کے زمانوں میں بادشاہی دستور حکومت ملک کے استحکام کے لئے نسبتاً بہتر ثابت ہوا۔ ان حالات میں عرب ممالک کے بعض پرجوش اور جذباتی عناصر کی یہ کوشش کہ مختلف علاقوں کو ایک کئے بغیر اور یکساں قسم کا دستور عائد کئے بغیر عرب قوم ترقی نہیں کرسکتی اور اپنے مسائل نہیں نبٹا سکتی، محلِ نظر ہے۔

ہمارا منشاء ہرگز یہ نہیں ہے کہ عرب ممالک یا اسلامی ممالک ہمیشہ منتشر رہیں اور ایک دوسرے سے قریب نہ آئیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کے دستوری اور سیاسی تصورات مسلمانوں کے ایک مشترکہ اور مرکزی اقتدار کو پسند کرتے ہیں، اور بدءِ اسلام سے اس صدی کے آخر تک مسلمانوں کے ایک مرکزی اقتدار (خلافت) کا تصور ضروری ہے۔ وہ ان کا آئیڈیل ہے اور اس کو حاصل کرنے کی ہر کوشش پسندیدہ ہے، لیکن عرب اتحاد کا رُخ اور اس کی منزل یہ نہیں ہے۔ وہ مغربی سیاست کے انتہا پسند مگر گھٹیا نظریات کی پیداوار ہے۔ اور سیاسی شعور کی ناپختگی اور جذباتیت کی آئینہ دار اس کی قوتِ متحرکہ معیوب نہ ہی، کیونکہ اس کا ہدف عرب اقوام کو باعزت مقام تک پہنچانا ہے۔ لیکن اس کے طریقے سیاسی سوجھ بوجھ کی علامت نہیں۔

المختصر ہماری دانست میں عربوں کی مشترکہ اور مجموعی فلاح و بہبود کا تقاضا یہ ہے کہ

یہ مختلف ممالک ایک دوسرے سے الجھنے، ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت کرنے اور ایک دوسرے کی داخلی سیاست کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوششوں سے احتراز کریں:

اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

جمہوریت اور شاہی کی کشمکش:

(۲) دوسری چیز جو عربوں کے دوامی اور وسیع تر مفادات کے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہے، وہ دستورِ مملکت اور آئین حکومت کا مسئلہ ہے، اس بارے میں جب تک کتاب و سنت کی تعلیمات میں ڈوب کر اپنی ملتِ اسلامیہ کی تقدیر کی روشنی میں عرب اور مسلمان اپنا قابلِ عمل اسلامی دستور وضع نہ کریں، اس وقت تک کسی مخصوص دستوری نظریئے کو مختار اور پسندیدہ قرار دینا اور اسی کو مثالی یا اسلامی سمجھنا صحیح نہیں، چاہے وہ جمہوری ہو کہ آمرانہ، مطلق العنان شاہی ہو کہ دستوری شاہی۔

مغرب کی دو صدیوں کی سیاسی محکومی اور ہمارے مذہبی و فکری زوال کے نتیجے میں بد قسمتی سے ہم مغرب کے جمہوری نظام کو بہترین سمجھنے کے علاوہ اسلام کے دستوری نظریئے کے بھی عین مطابق سمجھنے لگے، یہ ذہنی آزادی اور صحیح مطالعے کی کوئی علامت نہیں، مغرب کا جمہوری نظریہ مسترد ہو چکا ہے، بیسویں صدی کے عالمی حالات اور ترقی یافتہ سیاسی فکر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ ایک محدود حد تک انیسویں صدی میں برسر عمل رہا، سیاسی دائرے میں جمہوریت اور معاشی دائرے میں آزاد تجارت جو جمہوریت کے فلسفہ برلزم کی معاشی اور سیاسی شاخیں تھیں، بیسویں صدی میں دفن ہو گئیں۔

بیسویں صدی کا مقبول نظریہ مغرب میں اجتماعیت یا کلیت پسندی سیاسیات میں، اور کنٹرول، نگرانی معاشیات میں ہے۔ جمہوریت کی اساس "فردیت" پر تھی، اس کے بجائے آج مغرب کا چالو سکہ اجتماعیت (COLLECTIVEISM) ہے، اب فرد کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، بلکہ معاشرہ کو اصل اکائی سمجھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں جو نئی سیاسی قوتیں ابھریں چاہے وہ فاشی ہوں، نازی ہوں، یا کمیونسٹ، تینوں کا سیاسی فلسفہ جمہوریت کی نفی ہے۔

ان طاقتوں سے باہر یورپ کے جو اور ممالک ہیں، اور جو ابھی تک جمہوریت سے چپٹے ہوئے ہیں، یا تو ان کا حال پتلا ہے۔ یا پھر وہ جدید فلسفۂ سیاست سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ مصالحت کر رہے ہیں، فرانس کی مثال اور ڈیگال کا عروج، اسپین اور پرتگال کی آمریتیں اس کی کھلی نشانیاں ہیں۔

آج یورپ کے ممالک کی اکثریت جمہوری طرز حکومت کے بجائے آمرانہ طرزِ حکومت کے ماتحت ہے۔

مشرقی یورپ کے تمام ممالک مسلمہ طور پر جمہوری نہیں، مغربی بلاک میں بھی اسپین پرتگال یونان اور فرانس کو جمہوری نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جمہوریت کی اصلی کسوٹی تقسیم اختیارات (SEPARATION OF POWERS) اور تفریق اختیارات (DIVISION OF POWERS) ہیں۔

جن کا منشا یہ ہے کہ اقتدار مرکوز نہ ہو۔ منقسم ہو، اور وہ اس تقسیم اختیارات کے ذریعے پابند ہو جائے، دراصل یہ اختیارات اقتدار اعلیٰ یا سربراہ مملکت کو جکڑ دیتے ہیں، قرون مظلمہ (DARK AGES) میں اس مرکوز اختیار کے جو بھیانک نتائج مغربی اقوام کو بھگتنے پڑے، دراصل یہ ان کا ایک ردِ عمل تھا۔ اس کو حکیمانہ اصول سمجھنا سیاسی بصیرت کے فقدان کے مترادف ہے۔ منقسم اور محدود اختیار اجتماعی فلاح و بہبود کی مؤثر نگہبانی کا اہل نہیں، اپاہج سربراہ مشکل مسائل اور مفاجاتی خالات سے کبھی بھی نہیں نبٹ سکتا تھا۔ اور آج کی دنیا میں تو مسائل اتنے پیچیدہ اور اندرونی و بیرونی عوامل کے دباؤ سے تو ایسے لاینحل ہوتے جارہے ہیں کہ غیر معمولی عزیمت کے بغیر ان کو نبٹایا نہیں جا سکتا۔

عوام کی مرضی اور اپنے مسائل کو نبٹانیکے بارے میں ان کے فطری حق کی باتیں کیسی ہی دل خوش کن اور ہمارے انفرادی " انا " کی تسکین کا باعث ہوں، ہمارے قومی " انا " کے ارتقار اور بقار کی ضمانت کی نعم البدل نہیں ہوسکتیں۔

اِن حالات میں طریق حکومت پر زور دینا اور اس کے ذریعے ملّی تحفظ و سلامتی کے بڑے مسائل کو الجھانا دانشمندی نہیں۔ کوئی طرزِ حکومت ہو، ہمارے اپنے نظریۂ سیاست کے لحاظ سے اس کا مقصد قابلِ لحاظ ہے، نہ کہ اس کی ہیئت دستوری۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق ایک یورپی ماہرِ دستور نے کہا تھا کہ صرف بے وقوف ہی طرزِ حکومت کو دیکھتے ہیں۔

الغرض مغرب کے جمہوری فلسفے سے اس حد تک متاثر ہونے سے کہ تمام دیگر ملحوظات اس کے تابع ہو جائیں، اسرائیل کا ناسور گہرا ہوتا جارہا ہے۔ اور عرب دنیا باہم مختلف اور منتشر ہے، اس کی قوت مرکوز نہیں ہو سکتی، جب تک طریق حکومت کے بارے میں مختلف عرب ممالک رواداری اور مسالمت کے اصولوں کو نہیں اپنائیں گے، وہ آپس میں برسرِ پیکار رہیں گے، اسرائیل قوی تر اور مستحکم تر ہوتا جائے گا، کیا یہ کوئی دانشمندی ہوگی کہ صرف جمہوری نظریئے کی خاطر اپنے عظیم تر ملی مفاد کو خطرے میں مبتلا کیا جائے۔ جبکہ اس کے اور بھی خطرناک پہلو ہیں۔

جمہوریت کو صرف ایک سیاسی یا دستوری طریقہ سمجھنا صحیح نہیں، وہ ایک مکمل فلسفہ ہے جو ہمہ گیر ہے، اور اس کے اصول ہمارے بنیادی اصولوں سے ٹکراتے ہیں، جمہوریت میں اقتدار عوام کا ہے، اس لئے وہ اپنے اس اقتدار اعلیٰ کے استعمال میں بلا روک ٹوک ہر طرح قانون بنا سکتے ہیں، کیا مسلم معاشرہ بھی ایسا کر سکتا ہے؟ وہ آزاد نہیں، کتاب و سنت کی مرضی کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔

جمہوریت مساوات کی حامی ہے، بیشک ہم بھی اس کے حامی ہیں، لیکن اس مساوات کا ایک پہلو مرد و عورت کی مساوات بھی ہے۔ کیا ہمارا آئین اس کا متحمل ہو سکتا ہے؟

یہ بڑی سادہ مزاجی کی بات ہے کہ ہم صرف چند مشترک چیزوں کے مدنظر یہ فیصلہ کرلیں کہ اسلام کا نظریۂ سیاسی اور جمہوریت ایک ہیں۔

ہماری رہنما طاقتیں کتاب و سنت اور ہماری تاریخ نام نہاد جمہوریت کی تائید کرنے سے قاصر ہیں، خلافتِ راشدہ ہو کہ بعد کے ادوار، ان سے، کتاب و سنت کے احکامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دستورِ مملکت کا مسئلہ اسلام کے نزدیک ایسے لچکدار اصولوں پر مبنی ہے جو ماحول کے تقاضوں کے مطابق کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اپنے معاملات کا بہتر اور مؤثر انصرام کرسکتا ہے۔ یہ انتخاب کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے۔ نامزدگی کے ذریعے بھی اور موروثی ملوکیت کے تحت بھی۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکابر اور ہمارے فقہاء نے ہر طریقے کی حکومت اور خلافت کو تسلیم کیا، ان کا یہ نقطۂ نظر ان کی وسعت نظر کی علامت ہے، نہ کہ ان کی کمزوری کی۔

جو لوگ جمہوری نظریئے کے دلدادہ ہیں، ان سے ہمیں کوئی بحث نہیں، لیکن ہمیں اس سے ضرور بحث ہے کہ کوئی خصوصاً اپنی پوری تاریخ کو نہ جھٹلائیں اور اپنے اکابر کی تحقیر نہ کریں۔

اگر جمہوری نظریہ اسلام کا مطلوب و مقصود ہوتا تو ہمارے اسلاف کیا بے بصر تھے؟ یا (خاکم بدہن) مداہن، زمانہ ساز اور اقتدار پرست تھے؟ ہماری غیرت اور ہمارا مطالعہ دونوں اس سے انکار کرتے ہیں۔

بات لمبی ہو گئی، لیکن مجبوری تھی، گزشتہ سو سال میں عالمِ اسلام کی تباہی اور مصیبت کا ایک بڑا سبب یہی جمہوریت کا بیرونی تخیل تھا جس نے ہم کو یہ روزِ بد دکھایا، اسی جمہوریت کے چکّر میں اس عالمِ اسلام کے اتحاد کے سب سے بڑے داعی سلطان عبدالحمید خاں کو خلافت سے معزول ہونا پڑا، اور مغربی جمہوریت کے جن پرستاروں نے اس کو معزول کرکے اتحاد اسلامی کے سب سے بڑے داعی کو ختم کیا تھا۔ انہوں نے بعد میں چل کر الغاءِ خلافت کے ذریعے مسلمانوں کی مرکزیت کو بھی ختم کردیا، اور آج اس کا بدترین ثمرہ اسرائیل اسی برباد شدہ خلافت کے کھنڈر پر قائم ہے۔

اگر جمہوریت کا یہ وبال نہ آتا اور ترکی کی خلافت کو ختم نہ کردیا جاتا تو کیا اسرائیل کے قیام کی کوئی گنجائش تھی؟

از ماست کہ بر ماست

الغرض جمہوریت کے فلسفے اور اس کی بھی چند مخصوص و محدود شکلوں کی پرستاری آج نہ صرف عرب ممالک کے مسائل کو الجھا رہی ہے، بلکہ دیگر اسلامی ممالک کے گلے کا بھی ہار بنی ہوئی ہے کیونکہ ذہنی غلامی کے تحت ہم محض مغرب کی ریس میں نام نہاد جمہوریت کی پرستش کررہے ہیں، اور دیگر طرز حکومت کو بغیر سوچے سمجھے ہر صورت میں مُضر سمجھتے ہیں، اور خصوصاً بادشاہت کو کسی صورت میں بھی بخشنے کے لئے تیار نہیں، لیکن کبھی ہم نے اس پر غور کیا ہے کہ ہماری تاریخ اس کی شاہد ہے کہ موروثی بادشاہوں میں ایسے فرماں روا گذرے ہیں جن کی مثال پوری تاریخ اسلامی پیش نہیں کرسکتی، حضرت عمر بن عبدالعزیز رح نورالدین زنگی، اورنگ زیب عالمگیر،

صرف تین مثالیں ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں کہ دنیا کا کوئی جمہوری حکمراں نہ تو اُن کی طرح بے غرض تھا، اور نہ ان کی طرح دنیا کے کسی جمہوری ملک میں عام رعایا آسودگی اور مرفہ الحالی کی معراج پر پہنچی تھی، اس کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت میں تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ان کی عظیم الشان مملکت میں جو زکوٰۃ یا حکومت کی امداد لینے پر آمادہ ہو، ہر شخص خود صاحب نصاب بن گیا تھا۔ اور یہ صورت حال آج دنیا کے سب سے دولتمند ملک ممالک متحدہ امریکہ میں بھی نہیں کہ سو فی صد آبادی صاحب نصاب ہو اور وہ حکومت کو محصول ادا کرتی ہو۔

اگر ان پرانی مثالوں پر آپ غور کرنا نہیں چاہتے تو خود اسرائیل کے قبضے کی مثال سامنے ہے، اسرائیل سے شکست کے بعد جب خرطوم میں عرب ممالک جمع ہوئے تو محسوس کیا گیا کہ مصر، شام اور اردن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اور اُن کی بحالی ناگزیر ہے تو ان کی پابجائی کرنے والے لیبیا کے شاہ ادریس، سعودی عرب کے شاہ فیصل اور کویت کے شیخ تھے۔

بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ انہوں نے دو ارب روپیہ دیا، بلکہ اس سے زیادہ اہم ہے کہ انہوں نے ملی یک جہتی کے احساس میں پہل کی، اور دوسری بات یہ ہے کہ اُن کا طرزِ حکومت ایسا تھا کہ وہ وقت پر اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کے قابل تھے، یہ نہ سمجھئے کہ تیل کی آمدنی کی وجہ سے وہ اس پوزیشن میں تھے، تیل کی آمدنی تو اور عرب ممالک کو بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن صرف ان تین ممالک کا یہ رویّہ اس کو ظاہر کرتا ہے کہ شاہی صرف برائی ہی برائی نہیں، ہم نہ تو اس کے وکیل ہیں اور نہ جمہوریت کے مخالف، دونوں ہی دونوں طرزِ حکومت کی دو مثالیں ہیں جن کا خیر و شر اضافی ہے اور اس کی کسوٹی ان کی حکومت کے مقاصد ہیں۔ اگر مقاصد اسلامی اور کتاب و سنت کے مطابق ہیں تو بادشاہی بھی مستحسن ہے اور اگر یہ نہیں تو دیگر طرزِ حکومت بھی قابل نفرت۔

اس لئے ہم نہایت دردمندی سے یہ گزارش کر کے بحث ختم کریں گے کہ :-

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی ہستی کے تجلی زار میں آباد ہو

عربوں اور عالم اسلام کی معاند طاقتوں کے مقابلے میں بے بسی اور عالمی سیاست میں بیچارگی کی بڑی وجہ حکمرانوں اور عامۃ المسلمین کی باہمی آویزش ہے جس کو جمہوریت کا نظریہ اور بادشاہت کے ادارے کی جا و بیجا مذمت ہوا دیتی ہے، اس مسئلے میں احساس تناسب کے بغیر ہمارے مسائل بدستور الجھے رہیں گے اور ہم پیچھے ہٹتے جائیں گے۔

وحدت کی بنیاد:

(۳) تیسری بات جو عرب ممالک کے لئے قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ عرب قومیت اور عرب لیگ کے استحکام کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی اتحاد کو بھی اتنا ہی اہم سمجھیں، ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو محض عرب قومیت کے تصور کو اسلامی

تعلیمات یا اتحادِ اسلامی کے خلاف سمجھیں، وہ قومیت مُضر اور اسلام کے خلاف ہے جس سے "قومیت اسلام" کی جڑ کٹے، اقبال سے زیادہ اتحادِ اسلامی کا حامی اور کون ہو سکتا ہے؟ نثر اور نظم میں بڑی کثرت سے ان کے افکار میں اس سے متعلق پختی تلی رائیں ملتی ہیں، لیکن جہاں وہ "ملت از وطن است" کہنے والوں کو:

"بے خبر ز مقامِ محمد عربی"

کہتے ہیں وہاں خود بھی ایک سچے کی بات لکھتے ہیں:

"اس وقت ہر اسلامی ملک کو چاہئے کہ وہ اپنی خودی کی گہرائیوں میں ڈوب جائے، اور کچھ عرصے کے لئے اپنی توجہ صرف اپنی حد تک مرتکز کر دے، تاکہ ہر ملک قوی اور زبردست ہو کر حکومتوں کا ایک خاندان تشکیل دے سکے،

میرے خیال میں خدا ہم پر بتدریج یہ حقیقت منکشف کر رہا ہے کہ اسلام نہ تو قومیت ہے، اور نہ استعمار، بلکہ ایک جمعیت اقوام ہے جو مصنوعی سرحدوں اور نسلی امتیازات کو عملی سہولتوں کے لئے تسلیم کرتا ہے"

اس لئے ہم عرب قومیت کے اتحاد کو اتحادِ اسلامی کے مخالف نہیں سمجھتے، بشرطیکہ وہ عظیم تر اتحادِ اسلامی کے راستے میں حائل نہ ہو اور عبوری زمانے کے لئے ہو۔ کیونکہ عرب اقوام باوجود اپنی عددی قوت، رقبے، دولت اور وسائل کے کسی طرح تنہا اپنے مفاد کو نہیں بچا سکیں، اور نہ دنیا کی دوسری اقوام کے وعدوں پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔ جس کو واضح ثبوت بار بار اسرائیل کے سلسلے میں مل چکا ہے۔ وہ صرف اپنے مسلم بھائیوں کی ہمدردی ہی پر بھروسہ کر سکتے ہیں:

"خون بہر حال پانی سے بڑا ہوتا ہے"

اور ہمیں اب تجربہ بھی ہو چکا ہے کہ کتنے ہی کمزور سہی، وہی ان کے آڑے وقت میں اپنی بساط بھر ان کا حق رفاقت ادا کر سکتے ہیں۔

دیگر مسلم اقوام سے اتحاد کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ وہ اپنی باہمی اتحاد کی کوششوں کو ترک کر دیں یا اور اقوام سے تعلقات توڑ لیں۔ لیکن ان کے لئے اور دیگر مسلم اقوام کے لئے دو ٹوک بات یہ ہے کہ سیاسی معاہدات اور حلیفانہ تعلقات صرف اسی وقت کام آتے ہیں جب کہ وہ طاقتور ہوں، سیاسیات اور خصوصاً بین الاقوامی سیاسیات کی بنیاد اخلاقیات پر نہیں، قومی مفادات پر ہوتی ہے، اور ان ہی کی روشنی میں وقت پڑنے پر یہ معاہدے اور دوستیاں ختم ہوتی ہیں۔ ان کے وفادار ساتھی صرف اسلامی ممالک ہی ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں، ان کی کمزوری باہمی تحفظ کا ایک بہت بڑا یوں ہے کہ اسلامی ممالک کی سیاست حقیقت پسندانہ ہوگی اور وہ اپنی حقیقی طاقت کی روشنی میں اپنی پالیسی مرتب کریں گے اور چلائیں گے۔ کسی کی شہ پر دھوکے میں آکر قبل از وقت کوئی اقدام نہیں کریں گے۔

پھر یہ اتحاد بھی کوئی ضروری نہیں کہ علانیہ، رسمی اور سیاسی، اور جنگی ہو۔

یہ محفوظ میدانوں میں بے ضرر طریقے سے بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً وہ تجارت اور منصوبہ بندی میں دیگر اسلامی ممالک سے تعاون کریں، تاکہ وہ مل جل کر اپنی طاقت بڑھا سکیں، ان کا باہمی تعاون ایجابی طور پر ان کے باہمی ترقی کے مسائل میں بھی مدد دے گا، اور سلبی طور پر بھی ان کے دشمنوں کی کمزور کرے گا، یہ ایسی سرد جنگ ہوگی جس پر ان کے اور مسلمانوں کے دشمن بھی حرف گیری نہیں کر سکتے، مثلاً عرب ممالک کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان طاقتوں سے حتی الامکان بغیر کسی شور و شغب کے لین دین بند کریں جو اسرائیل نوازی میں پیش پیش ہیں۔ ان کے مال کا بائیکاٹ ضروری نہیں، کیونکہ اس کا کچھ حصہ ان کی ترقیاتی ضروریات کے لئے ناگزیر ہے، لیکن وہ تعیشات کی چیزیں ان سے منگوانا چھوڑ دیں اور ضروریات میں بھی وہ دیگر اسلامی ممالک کی مصنوعات پر تکیہ کریں، اپنے محفوظات کو ضائع کرنے اور اس کے ذریعے اغیار کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اس کو یا تو خود اپنے طور پر منفعت بخش طریقے سے خرچ کریں یا پھر ضروری تحقیقات کے ساتھ اپنے مسلم بھائیوں کی مدد کریں۔

پونڈ کی قیمت کم ہو جانے کے نتیجے میں آج کی اطلاع کے مطابق صرف کویت کو دو کروڑ دو لاکھ ڈالر کا نقصان ہوا ہے۔ اس نقصان سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ بات ہے کہ ان عرب ممالک کا اربوں سرمایہ یورپی ممالک کے بنکوں میں محفوظ ہے جن سے یورپی ممالک استفادہ کرتے اور اپنی معیشت کو مستحکم بناتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ عرب اور دوسرے اسلامی ممالک اپنی محفوظات کو یا تو خود پیدآور اغراض کے لئے مصروف کریں، یا دیگر اسلامی ممالک کو مدد دیں۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ وہ مشترکہ صنعتوں کا آغاز کریں اور اسلامی ممالک میں صنعتیں قائم کریں۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنی کمزوری اور اپنے دیگر مسلم بھائیوں کی کمزوری کو دور کریں جو اسرائیل کے خطرے سے مشترکہ طور پر نبٹنے کے لئے ناگزیر ہے

جتھہ بندیاں:

(۴) عرب ممالک اور دیگر اسلامی ممالک کے لئے یہ از بس ضروری ہے کہ وہ بڑی اقوام کی جتھہ بندیوں سے بالکل الگ رہیں، اور اس ترغیب کا شکار نہ ہوں کہ وہ اوروں سے مل کر کوئی تیسری طاقت بنائیں۔

ماضی قریب میں جو تجربہ ہو چکا ہے وہ تیسرے بلاک کی بے اعتباری کے لئے کافی ہے۔ اسرائیل کے مقابلے میں عرب ممالک کی اکثریت افریقی تھی، لیکن افریقی اتحاد کی تنظیم ان کے کسی کام نہیں آئی، اور نہ غیر جانبدار بلاک کی طاقت قابلِ اعتبار ثابت ہوئی، اصل یہ ہے کہ سیاسی رفاقت میں کمزور فریق ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے، طاقتور فریق اس سے استحصال کرتا ہے، اس لئے جب تک عرب ممالک یا عالمِ اسلام اپنی کمزوری کو دور نہ کرلے، اس کی رفاقت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر اس طریقے کو آزمانے کی کوشش یا اس پر بھروسہ سعی لاحاصل ہے۔

(۵) بین الاقوامی جتھہ بندیوں سے علیحدہ رہنے
پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ نہیں کہ وہ عالمی سیاست
ے الگ تھلگ رہیں، یا عالمی تنظیموں کا بائیکاٹ
ریں۔ وہ ان میں شریک رہ کر بھی فائدہ
ٹھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ متفق الخیال ہوں۔
یسی، تمام عالمی تنظیمیں معینہ مقاصد کے لئے
یں، اور ان ہی معینہ مقاصد کے تحت کچھ
ڑے مسائل ہیں جو بار بار پیش آتے ہیں، ان
ے متعلق اگر وہ اپنا کوئی متحدہ نقطۂ نظر
ائیں اور ہم آواز ہوں تو وہ کسی معین دوستی
معاہدے سے زیادہ منافع حاصل کر سکتے
ں، اور اپنے دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے
سامان! لیکن اس کی اولین دو شرائط ہیں۔
ہلی یہ کہ وہ دوسرے اسلامی ملک کے اندرونی
ملے میں بالکل مداخلت نہ کریں، اور وہ اگر
ی کسی مصلحت کے تحت کسی اسلامی یا غیر
لامی ملک سے کوئی معاہدہ کرے جو اپنی نوعیت
ں کسی دوسرے اسلامی ملک کے اصلاً خلاف
ہو تو اس کا بُرا نہ منائیں۔

اس کے لئے انہیں کوئی بڑی قربانی نہ کرنی
ے گی، آج بھی تمام اسلامی ممالک منشور متحدہ
وام کے دستخط کنندگان کی حیثیت سے اس
پابند ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ کسی بھی اسلامی
کے مسلمہ دشمن کے ساتھ کوئی معاہدہ ہی نہ
یں، بلکہ اس کے ساتھ دوستانہ برتاؤ بھی
ابر نہ کریں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی ممالک
ے نزاعی مسائل چاہے اسرائیل ہو، یا قبرص،
ریٹیریا، یا کشمیر یا افریقہ کے مسلم علاقے،
ان کے حل کی مشکلات دور ہوں گی اور ان کی
تائید میں دنیا کی انصاف پسند رائے عامہ
ابھرے گی۔

نام نہاد غیر جانبداری:

(۶) اور آخری بات یہ ہے کہ وہ نام نہاد غیر
جانبداری کے اصول سے علانیہ بے تعلقی کا اظہار
کریں، غیر جانبداری آج کی دنیا میں مہمل ہے۔
وہ صرف ایک فریب ہے۔ لیکن اس کا استعمال
اخلاقی ملحوظات سے بے پرواہی کا ثبوت مہیا
کرتا ہے، طاقتور اقوام اپنے بین الاقوامی برتاؤ
میں بد اخلاقی کے فلسفے کو اپنا سکتی اور اس کی
مضرتوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ لیکن کمزور
اقوام اس کھیل کو کامیابی سے نہیں جیت سکتیں،
اس کے برخلاف وہ اخلاقی حیثیت سے فائدہ
اٹھا سکتی ہیں، جبکہ وہ اس کھیل سے الگ تھلگ
رہیں اور اپنے عمل سے یہ ظاہر کریں کہ تمام بین الاقوامی
نزاعات کا وہ ہر مسئلے کی نوعیت کے لحاظ سے
حق و انصاف کی بنیاد پر رائے کا اظہار کریں گے۔
اور ناحق کا ساتھ نہیں دیں گے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے مذہب
کے احکام ہمیں ظلم کی حمایت یا اس سے چشم پوشی
کی اجازت نہیں دیتے، اور اس لئے بھی کہ بین الاقوامی
سطح پر ہمارے کچھ لازمی فرائض ہیں، مثلاً یہ کہ دنیا
کی آبادی کا بہت بڑا اور مؤثر حصہ عیسائی ہے۔ جس
سے ہمارے تاریخی تعلقات ہیں، گو ان تعلقات
کا اکثر حصہ باہمی جنگ و جدل کی داستان ہے۔
لیکن اس کے باوجود ہم مستقبل کو پابند نہیں بنا سکتے
اور توقع رکھ سکتے ہیں کہ ہمارے اور ان کے مفاد

کے پیش نظر ان کا طرز عمل بدلے گا۔

آخر میں مجھے اس امر کی کوئی معذرت کرنی نہیں ہے کہ یہ تدابیر اسرائیل کے قضیئے کا کوئی فوری حل نہیں ہیں، ایک طویل المیعاد پالیسی کی نشاندہی کرتے ہیں، اسرائیل کا قضیہ ہو کہ عالم اسلام کے اور مسائل، وہ گہرے طور پر امتِ مسلمہ کی مستقبل قریب تک محکومی اور حال میں اس کی بیچارگی کی نشانیاں ہیں، ان کو فوری طور پر ختم کرنے کی سوچنا نہ عملی سیاست ہے اور نہ اس سے مایوس ہونے کی ضرورت ہے۔ ان کے تعطل اور وقتی ناکامی کے مقابلے میں مقاومت کا اٹل جذبہ ہی مستقبل کی کامیابی کی واحد ضمانت ہے۔

اس روشنی میں ہمیں سوچنا پڑے گا، اور اس موقعہ کا انتظار کرنا پڑے گا جبکہ ہمارے دشمن اپنی ناانصافیوں کے بوجھ سے دب جائیں، اور آپس میں مختلف ہو جائیں، اور وہ دن دور نہیں

تحسبھم جمیعاً وقلوبھم شتّٰی[۱۴]

آپ انہیں مجتمع سمجھتے ہیں، اور ان کے دل مختلف ہیں،

دار العلوم کراچی

حضرت زکی کیفی

"اس ماہ سے دار العلوم کی عمر کا اٹھارواں سال شروع ہو رہا ہے، اس مناسبت پر حضرت زکی کیفی نے یہ نظم البلاغ کے لئے کہی ہے، اور بلا شبہ اس میں پوری شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ دار العلوم اور اس کے اکابر کا مکمل تعارف، اور اس کے مقاصد و عزائم کی دلآویز جھلک موجود ہے، امید ہے کہ قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔" (ادارہ)

یہ کونسا جہاں ہے، کہاں پر میں آگیا؟
دل پر سرور و کیف کا عالم سا چھا گیا
دنیا کے شور و شر کا یہاں نام بھی نہیں
لب پر حدیثِ گردشِ ایام بھی نہیں
دل میں یہاں ہوا و ہوس کا گذر نہیں
جنت نما ضرور ہے جنت اگر نہیں
مستی فضا پہ دل پہ عجب بے خودی سی ہے
محسوس ہو رہا ہے۔ یہ دنیا نئی سی ہے
یہ رفعتیں یہ اوج و بلندی خیال کی
سنتا ہوں بازگشت اذانِ بلال کی

کیف و سرور و نور کا ہر سو ہجوم ہے
یہ درس گاہِ دین ہے، دار العلوم ہے

امداد کی دعائے سحر کا اثر ہے یہ
چشم و چراغ دیدۂ اہلِ خبر ہے یہ
یہ ولولہ ہے سید احمد شہیدؒ کا
اس میں جھلک رہا ہے تفقہ رشیدؒ کا
"نور محمدیؐ" کے ہیں انوار ہر طرف
قاسمؒ کے علم و زہد کے آثار ہر طرف
علم و عمل سے ربط ہے اور بے مثال ہے
یعقوبؒ کی نگاہ کا حسن و جمال ہے
آیت ہے ایک رحمتِ پروردگار کی
یہ ہے۔ مرادِ عابدِ شب زندہ دار کی
دنیا و دیں کا اس میں مرتب نظام ہے
یہ اشرفِ زمانہ کا فیضانِ عام ہے
پیکر ہے شیخ ہندؒ کے فکر و شعور کا
پرتو ہے ایک حضرت انورؒ کے نور کا
شکر خدا کہ پاک زمیں پر نصیب کی
یہ زندہ یادگار عزیز اور حبیب کی
پاکیزگیٔ سید اصغرؒ خمیر میں
شبیرؒ کے علوم ہیں اسکے ضمیر میں
آسودہ روح ہو گئی تسکیں مل گئی
تعبیرِ خوابِ حضرتِ یٰسینؒ مل گئی

بے شک یہ اک نشان ہے شانِ رفیع کا
یہ نخلِ آرزو ہے محمد شفیع کا

دار العلوم نام عمارات کا نہیں
دار العلوم نام جمادات کا نہیں
نقش و نگار و منبر و محراب بھی نہیں
یہ سبزہ زار و گلشن شاداب بھی نہیں

یہ درسگاہ و گنبد و مینار ہی نہیں — دار العلوم - یہ در و دیوار بھی نہیں
دار العلوم منطقِ یونانیاں نہیں — دار العلوم - عقل کی حیرانیاں نہیں
دار العلوم - نام نہیں قیل و قال کا — یہ فلسفہ کا نام، نہ بحث و جدال کا
زورِ بیان - و شورِ خطابت نہیں، نہیں — علمِ عروض و حسنِ بلاغت نہیں، نہیں
دار العلوم روح کی پاکیزگی کا نام — قلب و نظر کی - روح کی آسودگی کا نام
دار العلوم نفس کا ہر آن احتساب — معروف پر عمل ہے - یہ منکر سے اجتناب
دار العلوم نام ہے حسنِ حیات کا — دار العلوم نام ہے فکرِ نجات کا

یہ اسوۂ رسولؐ پہ چلنے کا نام ہے
خوف خدا سے دل کے پگھلنے کا نام ہے

دار العلوم - گلشنِ توحید کی بہار — دار العلوم حسنِ حقیقت کا جلوہ زار
دار العلوم - دیدۂ بینائے آب و گل — دار العلوم مظہرِ اسرارِ اہلِ دل
دار العلوم - میکدۂ بادۂ کہن — دار العلوم صبح کی پیغامبر کرن
دار العلوم - جذبۂ بیتاب کی نمو — دار العلوم بحرِ نبوت کی آب جو
دار العلوم - راہِ محبت کا راہبر — دار العلوم اہلِ بصیرت کی راہگذر
دار العلوم - صبحِ سعادت کا آفتاب — دار العلوم رحمت و برکت کا ایک باب
دار العلوم - اہلِ محبت کا کارواں — دار العلوم منزلِ محبوب کا نشاں
دار العلوم - چشمۂ انوارِ علم و فن — دار العلوم عشق کا دریائے موجزن
دار العلوم - عزم ارادے کا اک جہاں — دار العلوم جہدِ مسلسل کی داستاں
یہ حضرت شفیع کی ہمت کا شاہکار — یہ حضرت شفیع کی عظمت کا اشتہار
یہ حضرت شفیع کے انفاس کی مہک — یہ حضرت شفیع کے جلووں کی اک جھلک
یہ حضرت شفیع کے پیغام کا امیں — یہ حضرت شفیع کے خوابوں کی سرزمیں
یہ حضرت شفیع کے سینے کا سوز و ساز — یہ حضرت شفیع کا محبوب دلنواز
یہ حضرت شفیع کے جذبات کا چمن — یہ ان کے علم و زہد و تفقہ کا بانکپن

دیکھا اسے تو ظلمتِ غم دور ہوگئی
دنیائے دل نشاط سے معمور ہوگئی

اوہام کے تھے دل پہ جو بادل وہ چھٹ گئے — قلب و نظر سے یاس کے پردے سے ہٹ گئے
دیکھا اسے تو دیدہ و دل جھومنے لگے — آنکھوں میں کچھ نقوش حسیں گھومنے لگے
دنیائے آب و رنگ نگاہوں سے گر گئی — آنکھوں میں اک حسین سی تصویر پھر گئی
صدیاں سمٹ کے آ گئیں بزمِ خیال میں — ماضی کا حسن دیکھ لیا اس کے حال میں

انوار بندگی کے جھلکتے ہوئے ملے
پیشانیوں میں سجدے چمکتے ہوئے ملے

علم و عمل کی انجمن آرائیاں ملیں
نظروں میں وسعتیں ملیں گہرائیاں ملیں

دریا سبک خرام ملے چال ڈھال میں
کلیاں چٹک رہی ہیں یہاں بول چال میں

اظہار سادگی کا ہر اک خد و خال سے
واقف ہیں عصرِ نو کے فریبِ جمال سے

فخر و غرور و عجب و حسد کا گذر نہیں
ہونا تو چاہیئے تھا یہاں بھی۔ مگر نہیں!

احسان و عدل و زہد و تواضع عجیب ہے
ہر شخص کو یہ فکر۔ قیامت قریب ہے

ملتی ہے اہلِ دل کو طریقت کی راہ بھی
یہ مرکزِ علوم بھی ہے خانقاہ بھی

ہر سمت ذکر و فکرِ قیام و قعود ہے
دل میں خدا کی یاد لبوں پر درود ہے

معمور دل امید سے ہے اس کو دیکھ کر
ظلمت کدہ میں شب کے یہ ہے مژدہ سحر

دیکھا اسے تو نغموں سے آہیں بدل گئیں
میرے لبوں پہ آکے دعائیں مچل گئیں

یارب، لطافتِ دلِ جامی ملے اسے
ختم الرسل ؐ کا عشق دوامی ملے اسے

ہر قول و فعلِ جانِ حرم سامنے رہے
ابنِ عمرؓ کا نقش قدم سامنے رہے

دنیا یہ رنگ دیکھ لے سمع و قبول کا
ہر حال میں ہو سامنے اسوہ رسول ؐ کا

رازی کی فکر بھی یہاں دانش فروز ہو
اس کی رگوں میں عارفِ رومی کا سوز ہو

سائنس کے رموز سے یہ باخبر بھی ہو
اور اس کے ساتھ قدرتِ حق پر نظر بھی ہو

حامل ہو یہ علوم قدیم و جدید کا
قرآن سے بیان ہو۔ نزولِ جدید کا

یوں گتھیاں سلجھتی رہیں اقتصاد کی
اللہ کا کرم ہو اساس اعتماد کی

دنیا سے استوار ہو بنیاد دین کی
تعمیل اس طرح سے ہو شرعِ متین کی

حنبل کی استقامتِ حق اس کی شان ہو
اس کی ہر ایک بات صداقت نشان ہو

احساسِ کمتری ہو نہ اظہار برتری
اس کے غنا کی شان ہو فقر ابوذریؓ

تقلیدِ بوحنیفہؒ عالی مقام ہو
جب تک یہاں یہ بحثِ حلال و حرام ہو

ذوقِ امام مالکؒ عالی نسب ملے
عشقِ رسول پاکؐ بحسن ادب ملے

ناز و نیازِ عشق فنوں ساز بخشدے
مولا۔ اسے اویس کے انداز بخشدے

خالدؓ کی اس کو مستیٔ کردار بھی ملے
اخلاص و دردِ رومی و عطارؒ بھی ملے

اس کے بدن کو روحِ بلالی نصیب ہو
دل کو گداز قلبِ غزالی نصیب ہو

طہارت نصفِ ایمان ہے
(حدیث)
سوان برانڈ صابن
آپ ضرور پسند فرمائیں گے یہ صاف
ستھرے اور اُجلے کپڑے دھوتا ہے
SWAN
سوان
ذوالفقار
ZULFEQAR INDUSTRIES
LTD
یکے از مصنوعات

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم

آہ

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رح

آج سے چھپن سال پہلے ۱۳۳۱ھ میں جب احقر نے دارالعلوم میں کافیہ۔ قدوری وغیرہ اسباق میں داخلہ لیا تو ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے ایک ذہین فطین مگر سیدھے سادھے طالب علم سے ہمسبق ہونے کی حیثیت سے تعلق قائم ہوا اور دارالعلوم کے بہت سے اسباق میں انکی ساتھ شرکت رہی۔

مگر دوران تعلیم ہی میں انکو اصلاح اعمال کی فکر اور ذوق عبادت میں تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔ طالبعلمانہ شوخیاں ان کے پاس ہوکر نہیں گذریں۔ اجتماعات سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے۔ خوش نصیبی سے دوران تعلیم ہی میں انکو سیدی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری اور تربیت باطنی کا شرف حاصل ہوگیا۔

وہ اپنے نصاب تعلیم کو پورا کرکے خانقاہ تھانہ بھون کے ہو رہے۔ انکی فطری قابلیت کو حق تعالیٰ نے حکیم الامۃ قدس سرہٗ کی تربیت نے چار چاند لگادیئے اور بہت جلد وہ باطنی تربیت میں بھی ایک حد تک تکمیل کرکے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز ہوگئے۔ یہ ہیں وہ بزرگ جن کو اب ہم حضرت مولانا شاہ وصی اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہماری فراغت درس نظامی کی تکمیل سے ۱۳۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ مولانا موصوف دیوبند سے فارغ ہوکر سیدھے تھانہ بھون پہونچے اور علم و عمل کے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔

یہ ناکارہ درس نظامی سے فارغ ہوکر دارالعلوم دیوبند ہی میں اپنے اساتذہ واکابر کے حکم سے درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوکر اوس میں مشغول ہوگیا۔ اس عرصہ میں جب کبھی اپنے اس خوش نصیب ہمسبق کی یاد آتی تو بیساختہ میری زبان سے یہ شعر نکل جایا کرتا تھا؎

ما و مجنوں ہمسبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

یہاں تک کہ دس سال گذر جانے کے بعد ۱۳۴۶ھ میں احقر کو بھی یہ شوق دامنگیر ہوا کہ تھانہ بھون چلو اور اصلاح اعمال کے لئے حضرت سے استفادہ کی راہ نکالو۔ میرے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب حضرت حکیم الامت کے ہمسبق تھے۔ اس لئے بچپن ہی سے حضرت سیدی حکیم الامت مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔

۱۳۴۶ھ کی پہلی حاضری ہی میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں میری تعلیم و تعلم کی بیس سالہ محنت و مشقت اوس وقت تک ناکام ہے۔ جب تک اس مجدد وقت کی خدمت میں رہ کر اصلاح اعمال و اخلاق کی

فکر نہ کی جائے۔

دس روز کے قیام کی نیت سے یہ حاضری ہوئی تھی روزانہ مجلس خاص وعام میں شرکت ہوتی تھی۔ ایک روز مجلس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا وصی اللہ صاحب کا تذکرہ ایک خاص محبت وعنایت اور تحسین کے الفاظ میں فرما کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ آپ انکو جانتے ہیں۔

تھانہ بھون کے اس قیام نے اور بھی زیادہ میرے قلب میں اپنے اس ہمسبق کی سبقت کو قابل رشک اور اپنی تاخیر کو قابلِ حسرت وافسوس بنا دیا تھا اس سوال پر بیساختہ حضرت کے سامنے بھی میری زبان سے وہی شعر ہمسبق والا نکل گیا۔ ؎ او بصحرا رفت وما در کوچہ رسوا شدیم

حضرت قدس سرہٗ نے ایک خاص لطف کے انداز میں ایک جملہ ارشاد فرمایا۔

ہاں یہاں یہی دستور ہے کسی کو صحراء دیا جاتا کسی کو سہرا دیا جاتا ہے۔

ہر ایک کو جو کچھ عطا ہو اس پر راضی ہونا چاہیئے۔

بات آئی گئی ہوئی لیکن اپنے اس صحرا نورد ہمسبق دوست کے کمالات کی عظمت ہمیشہ دل میں رہی اس وقت بھی میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں ایک خاصی تعداد ایسے حضرات کی ہے جو اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب ہیں مگر انکی روشنی اس آفتاب عالمتاب کے سامنے ظاہر نہیں ہوتی حضرت کی وفات کے بعد یہ حضرات ہی مرجع خلائق بنیں گے۔ ان میں خصوصیت سے مولانا شاہ وصی اللہ اور حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ صاحب امرتسری ثم لاہوریؒ نظر جاتی تھی۔

اور حضرت قدس سرہٗ کی وفات کے بعد آنکھوں نے اس کا مشاہدہ کرلیا کہ ان دونوں بزرگوں کی مجلس ایک کیمیا تاثیر رکھتی تھی۔ ہزاروں مسلمانوں کی زندگیوں میں انکی صحبت و تعلیم سے عظیم دینی انقلاب آیا۔ ہزاروں بھٹکے ہوؤں کو راستہ پر لگا دیا۔

پاکستان بننے کے بعد احقر پاکستان آگیا مگر ہندوستان سے آنے والے دوستوں سے مولانا موصوف کے فیوض و برکات اور رجوع خلائق کا تذکرہ سنتا اور خوش ہوتا تھا خط لکھنے کا اتفاق طرفین سے کم تھا۔ مگر عجیب اتفاق ہے کہ اس آخری مرحلے میں احقر نے ایک خط لکھا جس کا جواب موصوف نے بمبئی سے دیا۔ یہ کیا معلوم تھا کہ مولانا موصوف کا یہ آخری خط ہے۔ یہ بھی بعد ہی میں معلوم ہوا کہ بمبئی کا یہ سفر حرمین شریفین کے قصد سے تھا اور ایک قافلہ آپکے ساتھ اس سفر مبارک میں شریک تھا۔

۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو آپ بمبئی سے اپنے رفقاء کے ساتھ مظفری جہاز پر بارادہ حج وزیارت سوار ہوئے۔

سُنا ہے کہ اس وقت عام حالات سے زیادہ صحت اچھی نظر آتی تھی۔ چند روز اس دریائی سفر میں اپنے معمولات عبادت اور تعلیم وتلقین کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ عمر کے آخری دن ۲۴ نومبر ۱۹۶۷ء میں بھی حسب معمول تہجد کی نماز صحت وتندرستی کے ساتھ ادا کر کے نماز فجر کے انتظار میں سنت کے مطابق کچھ دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے حسب معمول جب صبح کی نماز کا وقت قریب آیا تو خادم چائے کی پیالی لیکر حاضر ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ بیت اللہ کا مسافر رب البیت کے حضور میں پہونچ چکا ہے۔ سفر اور وہ بھی حج وزیارت کا سفر۔ وطن واعزاء سے دوری کتنے اسباب شہادت کے حق تعالیٰ نے جمع فرما دیئے۔ اس کو کوئی حسرت وافسوس کیا کرے۔ یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

خدا یہ موت دے سب کو ہم اس مرنے پہ مرتے ہیں۔

البتہ بزرگوں کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ موت العالِم موت العالَم مولانا شاہ وصی اللہ انہیں حضرات میں سے تھے جن کی موت تنہا ایک فرد کی موت نہیں ہوتی ایک قوم وجماعت کی موت ہوتی ہے ؎

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو!

خواتین اسلام سے

سرکارِ دو عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی باتیں

چوتھی حدیث

وَعَنْ اُمِّ بُجَیْدٍ رَضِیَ اللہُ تَعَالیٰ عَنْہَا قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللہِ اِنَّ الْمِسْکِیْنَ یَقِفُ عَلٰی بَابِیْ حَتّٰی اَسْتَحِیْ فَلَا اَجِدُ فِیْ بَیْتِیْ مَا اَدْفَعُ فِیْ یَدِہٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّے اللہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِدْفَعِیْ فِیْ یَدِہٖ وَلَوْ ظِلْفًا مُحَرَّقًا (رواہ الترمذی وقال حسن صحیح) (مشکوٰۃ ص۱۶۶)

ترجمہ:- حضرت ام بجید رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے دروازہ پر مسکین آکھڑا ہوتا ہے اور مجھ (اسے کچھ دئے بغیر واپس کرنے میں) شرم محسوس ہوتی ہے اور دینے کے قابل (خاص قابل ذکر) چیز گھر میں ہوتی نہیں (تو اس صورت میں کیا کروں) فرمایا (جو کچھ ہو سکے) اس کے ہاتھ پر رکھ دو اگرچہ (بکری وغیرہ کا) جلایا ہوا کھر ہی ہو۔

تشریح

جیسے ہدیہ لینے دینے میں نفسانی طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ ذراسی چیز ہے کیسے دیدیں؟ اور تھوڑی چیز ہدیہ دینے کو عار اور عیب سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح صدقہ خیرات کرنے میں بھی بہت سے لوگوں پر نفسانیت سوار ہو جاتی ہے، زیادہ دینے کو ہوتا نہیں یا زیادہ دینے کو دل نہیں چاہتا اور تھوڑا دینے کو شان کے خلاف سمجھتے ہیں، اس لئے صدقہ کرنے سے محروم رہتے ہیں، حضرت ام بجید رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہی سوال کیا کہ کوئی قابل ذکر چیز دینے کو گھر میں نہیں ہوتی اور سائل آکھڑا ہوتا ہے، اس کو خالی ہاتھ واپس کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے لہٰذا کیا کیا جائے؟ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کچھ ہو اس کو دیدو تھوڑے بہت کا خیال نہ کرو، اگر کچھ بھی نہ ہو تو بکری کا جلا ہوا کھر ہی دیدو۔ یہ بطور مثال کے فرمایا کیونکہ بکری کے پاؤں کا آخری حصہ جو زمین پر لگتا ہے اس میں نہ گوشت ہوتا ہے نہ کچھ اور چیز کھانے کے مطلب کی نکلتی ہے پھر جبکہ وہ جلا ہوا ہو تو بالکل ہی کسی کام کا نہیں، مطلب یہ ہے کہ مسکین کی مسکنت کا خیال کرو اسے کچھ نہ کچھ ضرور دو معمولی چیز ہو تو وہی دیدو اپنی کسر شان اور ناک کٹنے کا خیال کرتے ہوئے تھوڑی چیز کو نہ روکو، قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے۔ روزانہ ذرا ذرا سا صدقہ کرو تو آخرت میں بہت کچھ ملے گا، اور یہاں مسکین کی حاجت کسی درجہ میں پوری ہو جائے گی۔ بزرگوں نے بتایا ہے کہ جسمانی عبادتیں دخول جنت کا ذریعہ ہیں اور مالی صدقہ زکوٰۃ وخیرات دوزخ سے بچانے کے لئے اکسیر ہے۔

جو کچھ ہو خرچ کر دینا چاہیئے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ۔
اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ (مشکوٰۃ شریف)
دوزخ سے بچو اگرچہ آدھی کھجور ہی کے ذریعہ ہو

آٹھویں حدیث

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهَا قَالَتْ جَاءَتْنِي امْرَأَةٌ وَمَعَهَا ابْنَتَانِ لَهَا تَسْأَلُنِي فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِي غَيْرَ تَمْرَةٍ وَاحِدَةٍ فَأَعْطَيْتُهَا إِيَّاهَا فَقَسَمَتْهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا وَلَمْ تَأْكُلْ مِنْهَا فَخَرَجَتْ فَدَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَدَّثْتُهُ فَقَالَ مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ (رواہ البخاری ومسلم) (مشکوٰۃ شریف صـ۴۲۱)

ترجمہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ ایک عورت میرے پاس آئی جس کے ساتھ اسکی دو بچیاں تھیں، اس نے مجھ سے سوال کیا، میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ تھا میں نے وہ ایک کھجور ہی اس کو دیدی۔ اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دیدیا اور خود ذرا بھی کچھ نہ کھایا، اس کے بعد جیسے ہی وہ نکلی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دولت خانہ میں تشریف لے آئے، میں نے آپ کو پورا قصہ سنایا آپ نے فرمایا کہ جو شخص (مرد و عورت) لڑکیوں (کی دیکھ بھال اور پرورش و پرداخت) کے ساتھ مبتلا کیا گیا اور پھر اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو یہ لڑکیاں آتش دوزخ سے بچانے کیلئے اس کے واسطے آڑ بن جائیں گی۔

تشریح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک عورت سوال کرنے آئی ایک کھجور کے سوا کچھ موجود نہ تھا انہوں نے ایک کھجور ہی دیدی کم و بیش کا خیال نہ کیا، درحقیقت اخلاص کے ساتھ دیا جائے تو ایک کھجور اور ایک پیسہ بھی بہت ہے۔ قرآن شریف میں فرمایا وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللّٰهِ (جو کچھ بھی اپنے لئے پہلے سے بھیج دوگے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے) ایک حدیث میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کھجور کی برابر بھی حلال کمائی سے جو شخص صدقہ دیدے تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑی قدر کے ساتھ قبول فرماتے ہیں، پھر جس نے صدقہ دیا ہے اس کے لئے اس صدقہ کو بڑھاتے رہتے ہیں .... یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی برابر ہو جاتا ہے (بخاری ومسلم) بندہ نے دیا کھجور کی برابر، اور خدائے رحیم و کریم نے عنایت فرمایا پہاڑ کی برابر، بھلا ایسا داتا کون ہے؟ صدقہ سے کبھی دریغ نہ کرو، اس سے ضرورتمند کی حاجت بھی پوری ہوتی ہے اور صدقہ والے کو ثواب بھی ملتا ہے، کتنا ثواب ملتا ہے کہ اس کا اندازہ ابھی معلوم ہوا، اور مصیبت بھی صدقہ آنے سے رک جاتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بَادِرُوا بِالصَّدَقَةِ فَإِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا (یعنی مصیبت آنے سے پہلے صدقہ دیدو کیونکہ (صدقہ دیوار کی طرح آڑے آجاتا ہے اور) مصیبت اس کو پھاند کر نہیں آسکتی (مشکوٰۃ صـ۱۶۷)

حضرت عائشہ کی اس حدیث میں جہاں صدقہ کا بیان ہے لڑکیوں کی پرورش کی فضیلت بھی مذکور ہے، لڑکی ضعیف جنس ہے اور اس سے کما کر دینے کی امیدیں بھی وابستہ نہیں ہوتی ہیں، اس لئے بہت سے خاندانوں میں مظلوم و مقہور ہو کر زندگی گذارتی ہیں ان کے واجب حقوق بھی پامال کر دئے جاتے ہیں چہ جائیکہ اُن کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا برتاؤ کیا جائے، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لڑکیوں کی پرورش کرنے اور خیر خبر رکھنے والے کو بشارت سنائی کہ ایسا شخص دوزخ سے محفوظ رہے گا، اور لڑکیوں کی

پر خدمت اس کے لئے دوزخ سے بچانے کے لئے آڑ بنجائیگی
پنی لڑکی ہو یا کسی دوسرے کی
دوسرے مسلمان کی یتیم بچی ہو، ان سب کی پرورش کی
ہی فضیلت ہے۔ بہت سی عورتیں سوتیلی لڑکیوں پر ظلم
رتی ہیں اور بہت سے مرد اپنی بیوہ لڑکی یا غیر شادی شدہ
لڑکی سے گھبرا جاتے ہیں جس کا نکاح ہونے میں کسی وجہ سے
دیر ہو، اور بعض مرد نئی بیوی کی وجہ سے پہلی بیوی کی اولاد پر
ظلم کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اس حدیث سے سبق حاصل
رنا چاہیئے۔

حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت
ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں افضل ترین
صدقہ نہ بتادوں؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ افضل ترین صدقہ
یہ ہے کہ تم اپنی لڑکی پر خرچ کرو جو طلاق کی وجہ سے یا بیوہ
ہو کر تمہارے پاس (شوہر کے گھر سے) واپس آگئی تمہارے
علاوہ کوئی اس کے لئے کمائی کرنے والا نہیں ہے (مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ صہ ۴۲۵)

نیز سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے
تین لڑکیوں یا تین بہنوں کے اخراجات برداشت کیے، اور انکو
ادب سکھایا اور رحم و شفقت کا برتاؤ کیا یہاں تک کہ وہ اس کے
خرچ سے بے نیاز ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت واجب
فرما دیں گے، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر دو لڑکیاں
یا بہنیں ہوں جن کی پرورش کی ہو تو اس کے بارے میں کیا حکم
ہے۔ فرمایا اس کے لئے بھی یہی فضیلت ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ
اگر ایک لڑکی کے بارے میں سوال کیا جاتا تو آپ ایک کے لئے بھی
یہ فضیلت بتلاتے[2] (جیسا کہ ابھی دوسری حدیث میں آتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ رسول
اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے یہاں کوئی
لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ درگور نہ کرے۔ (جیسا کہ اسلام سے
پہلے عرب والے کرتے تھے۔) اور اس کے ساتھ ذلت کا برتاؤ
نہ کرے اور لڑکوں کو اس پر ترجیح نہ دے تو اللہ تعالیٰ ایسے
شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا۔[1]

---

[1] مشکوٰۃ صہ ۴۲۳ بحوالہ ابوداؤد

طلباء کیلئے

ہمیں افسوس ہے کہ گذشتہ دو ماہ سے بعض اہم مقالات کے
سبب طلباء کے صفحات شامل اشاعت نہیں ہو سکے، شعبان کے
شمارہ میں مضمون نگاری کے جس انعامی مقابلے کا اعلان کیا گیا تھا
اس کے لئے طلباء کے مضامین ہمیں موصول ہو چکے ہیں، اور حکم
صاحبان کے زیر مطالعہ ہیں، انشاء اللہ آئندہ شمارے میں
طلباء کے صفحات شامل ہوں گے، اور انہی میں مقابلے کے نتائج
کا اعلان کیا جائے گا ——— ادارہ

بقیہ آپ کے سوال

پڑھانے جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اپنے ساتھ
امام آدمی لیجائے تو بھی اُسے اجازت ہے؟

غلام مصطفیٰ ممبر، انجمن تبلیغ الاسلام بھاولپور۔

قیدی پر جمعہ پڑھنا فرض تو نہیں ہے۔ اس کے ذمہ ظہر کی نماز
فرض ہے۔ لیکن اگر نماز جمعہ جیل میں ادا کر لی جائے اور باہر والوں
کو بھی شرکت کی اجازت ہو یا شہر میں دوسری جگہ بھی جمعہ
ہوتا ہو جہاں دوسرے لوگ پڑھ سکیں تو اس صورت میں جیل میں
جمعہ ادا کرنے سے جمعہ ادا ہو جائے گا۔ خواہ امام باہر سے لیجائیں
خواہ اُن ہی میں کوئی شخص خطبہ اور امامت کا کام سنبھال لے۔

جواب طلب امور کیلئے ٹکٹ یا لفافے کا آنا ضروری ہے۔

مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری
استاذ دار العلوم کراچی

آپ کے سوال؟

صرف ایسے فقہی، علمی، ادبی، اور معاشرتی سوالات روانہ کیجئے جو عام دلچسپی رکھتے ہوں، اور انکا ہماری زندگی سے تعلق ہو، فضول اور مشہور سوالات سے پرہیز کیجئے، تمام سوالات کے جواب باری باری شائع ہوں گے۔ ادارہ

ملی نغمے

قومی نغمے جو گذشتہ ہندو پاک کی جنگ کے دوران سنائے گئے ہیں جن میں وطن کی محبت اور جذبۂ خدمت اور اتحاد و تنظیم کی تعلیم ہے۔ ساز و سرود کے ساتھ بجتے ہیں۔ کیا ان کا سننا جائز ہے یا نہیں؟

(عبدالرحمٰن گنڈور۔ سونڈا ضلع ٹھٹھہ)

ے اشعار ترغیب وتحریص کے لئے پڑھنا اور سننا سُنانا
ہے، خاص طور سے وہ اشعار جن سے ملک وملت کی
ت کے جذبات پیدا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ ساز و
ں کے ساتھ نہ ہوں، ساز و موسیقی ان کی ساری عمدگی پر
پھیر دیتی ہے اور ان کا سننا جائز نہیں رہتا، سرکار دوعالم
اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

نی ربی بمحق المعازف والمزامیر والأوثان والصلیب
الجاهلیة" (مشکوٰۃ شریف ص ۳۱۸)

ی میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ گانے بجانے کے سامان

بُت، صلیب اور جاہلیت کے رسم و رواج کو مٹادوں"

اس حدیث سے ساز و موسیقی، باجہ، سارنگی اور ڈھول ڈھولک وغیرہ کی ممانعت ثابت ہوئی، اور معلوم ہوا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ان جاہلیت کے نقوش کو مٹانا لازم ہے، پھر بھلا ان کو استعمال کی گنجائش کیسے ہوسکتی ہے؟ اور جہاد جیسے اہم دینی فریضے میں تو اس سے اور پرہیز کرنا چاہیئے۔

لفظ مولانا کا استعمال

عام طور سے علماء کے لئے "مولانا" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کیا غیر اللہ کے لئے اس لفظ کا استعمال جائز ہے، جبکہ قرآن کریم میں ہے۔ "انت مولانا"؟

(نورالدین صدیقی۔ کراچی)

عربی زبان میں لفظِ مولیٰ کے بہت سے معنی آتے ہیں قاموس میں اکیس معنی لکھے ہیں، حدیث میں آقا کو مولیٰ کہنے کی ممانعت بھی آئی ہے، اور اجازت بھی، جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ المصابیح نے باب الأسامی میں صفحہ ۴۰۷ پر دونوں طرح کی روایات نقل کی ہیں، مالکِ حقیقی کے معنی میں تو ظاہر ہے، غیر اللہ کے لئے یہ لفظ استعمال کرنا جائز نہیں، البتہ بعض دوسرے معانی کے اعتبار سے غیر اللہ کے لئے بول سکتے ہیں، مُلا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقات شرح مشکوٰۃ میں صفحہ ۶۰۴ ج ۴ پر لکھتے ہیں:

"والحاصل أن المولیٰ له معان متعددة منها ما یختص به سبحانه فلا یجوز استعماله فی حق غیره تعالیٰ وهو نعم المولیٰ"

علماء کرام کو عالم کے معنی میں "مولانا" کہا جاتا ہے، اگرچہ عربی زبان میں اس کے یہ معنی نہیں ہیں، مگر ہمارے عرف میں اسی طرح بولتے ہیں، لہذا لکھنا اور بولنا جائز ہے۔
عربی میں مولیٰ کا لفظ صاحب[1]، پڑوسی[2]، چچا[3]، شریک[4]، مددگار[5]، منعم[6]، محب[7]، ولی[8]، بھانجہ[9]، اور بھتیجہ[10] وغیرہ کے معنی میں آتا ہے۔

کتے کی کھال

ایک پالتو کتے کو ذبح کر دیا گیا، اور اس کی کھال کو کیمیکل سے دھو کر صاف کیا گیا اور خشک کر کے اس کی جائے نماز تیار کر لی گئی۔ کیا اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے؟ (ایضاً)

کتا پالتو ہو یا غیر پالتو، اگر اسے شرعی طریقہ پر ذبح کر دیا گیا اور اسکی کھال کو اس طرح صاف کر دیا جائے کہ سڑنے سے حفاظت ہو جائے اور آلائش دور ہو جائے تو حدیث شریف کے بموجب وہ پاک ہو جاتی ہے، ہدایہ میں ہے۔
وکل اھاب دبغ فقد طھر لا جلد الخنزیر والآدمی
آدمی اور خنزیر کے سوا جس کسی جانور کی کھال کو دباغت دیدی جائے وہ پاک ہو جاتی ہے۔

نماز فجر کا وقت مستحب

صبح کی نماز میں تو حدیث کا حکم یہ ہے کہ اسفروا بالفجر فانہ اعظم للاجر اور امام صاحب کا مذہب بھی یہی ہے کہ اسفار ہمارے مذہب میں ہے اور نیز حسامی باب الاجماع صفحہ ۹۶ میں اس عبارت کے اوپر "واذا انتقل الینا بالافراد الخ" یہ عبارت ہے کقول عبیدۃ السلمانی اجمع الصحابۃ علی محافظۃ الاربع قبل الظہر وعلی الاسفار بالفجر" یعنی صحابہ کا اجماع چار سنت مؤکدہ ظہر سے پہلے اور صبح کے اسفار یعنی روشنی میں نماز پڑھنے پر ہے اور کراچی اور پنجاب میں رمضان شریف کے مہینے میں۔ صبح کی نماز بالکل غلس یعنی اندھیرے میں طلوع فجر کے دس یا پندرہ منٹ بعد پڑھتے ہیں اور اس کے لئے لوگوں کی غفلت میں ہونا اور نیند دلیل بنائی گئی ہے۔ کیا اس کے لئے وجہ صحت ہے نیز یہ مخالفت اجماع اور مخالفت مذہب ہے یا نہیں۔ (ممتاز یوسفزئی)

احادیث شریفہ میں غلس اور اسفار دونوں کا ثبوت ملتا ہے، اسی وجہ سے حنفیہ شافعیہ میں اختلاف ہو گیا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی مختلف تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت اندھیرے میں نماز فجر شروع فرماتے تھے اور خوب اسفار کر کے ختم کرتے تھے، عبیدہ سلمانی نے اگر اس کو اجماع کہا ہے تو اس سے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماعی عمل مراد ہے۔ جن کو انہوں نے دیکھا تھا تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے تو انکی ملاقات نہیں ہوئی، پھر حنفیہ اسفار کو فرض واجب نہیں کہتے، ایک استحبابی عمل کرنے کی صورت میں اگر بالکل ہی فرض چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو اور غیر مستحب وقت میں نماز فجر پڑھ لینے سے اکثر لوگوں کو نہ صرف جماعت بلکہ نماز مل جاتی ہو اور سحری کھا کر سو جانے سے نماز چلے جانے کا نہ صرف شدید خطرہ ہو بلکہ اکثر کی نمازیں قضا ہو جاتی ہوں (جیسا کہ ان جگہوں میں دیکھا جاتا ہے۔ جہاں سحری کھا کر سو جاتے ہیں۔) تو اس صورت میں ترک مستحب پر عمل کرنا ہی بہتر ہے۔ خصوصاً جبکہ احادیث میں غلس میں پڑھنا بھی ملتا ہو اور ائمہ اربعہ میں سے حنفیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کا مذہب بھی ہو، تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ حنفی مذہب کی اتنی بیچ کہ خلاف مذہب غیر اولیٰ منظور ہو۔ خواہ نماز بالکل چلی جائے یہ مذہب کی حیثیت نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔

جیل میں جمعہ کی نماز

موجودہ دور میں جبکہ جیل خانوں میں گذشتہ کی طرح سخت مصائب نہیں بلکہ بہاول پور بورسٹل جیل میں باہر کی طرح طلباء کو تعلیم دیجاتی ہے۔ فیکٹریاں موجود ہیں۔ باہر سے بھی کسی حد تک آدمی جا سکتا ہے۔ سپاہی بھی جمعہ کی نماز میں شمولیت کرتے ہیں۔ قیدی باہر بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ وہ باہر آتے رہتے ہیں۔ کیا ان پر جمعہ واجب ہے؟ اور کیا باہر سے کوئی آدمی نماز جمعہ

نقد و تبصرہ

تبصرہ کیلئے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

دینی دعوت کے قرآنی اصول مصنفہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہم مہتمم دار العلوم دیوبند، شائع کردہ مجلس معارف القرآن (اکیڈمی قرآن عظیم) دار العلوم دیوبند، ضخامت ۱۳۲ صفحات، متوسط سائز، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع رنگین گردپوش قیمت دو روپے پچیس پیسے۔

پاکستان میں ارسال زر کا پتہ۔ حاجی شوکت علی صاحب سخاوت میڈیکل اسٹور نابھہ روڈ لاہور۔

اس کتاب میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم نے قرآن کریم کی آیت ادعُ إلی سبیل ربک بالحکمۃ الخ کو بنیاد قرار دیتے ہوئے تبلیغ دین کے ان اصولوں کی وضاحت فرمائی ہے جو قرآن و سنت سے معلوم ہوتے ہیں، اور اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں پیغمبرانہ اصول دعوت کی دلنشین تشریح کی ہے حقیقت یہ ہے کہ ایک داعیٔ اسلام کے لئے یہ کتاب ایک ایسا ضابطۂ کار تجویز کرتی ہے جو اس کے لئے سدا کامیابیوں کا ضامن ہو سکتا ہے، تبلیغ و دعوت کے جتنے بنیادی اصول قرآن و سنت سے ثابت ہوتے ہیں، تقریباً سبھی اس مختصر کتاب میں جمع کر دئے گئے ہیں، فاضل مصنف نے پیش لفظ میں اس بات کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ وہ ان اصولوں کے مطابق ایک تبلیغی جماعت تیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، خدا کرے کہ وہ اپنے اس عزم میں کامیاب ہوں، آمین!

ہماری رائے میں حضرت قاری صاحب مدظلہم العالی کی یہ تصنیف اُن تمام حضرات کو ضرور پڑھنی چاہیئے جو کسی نہ کسی نوع سے تبلیغی کام میں مصروف ہیں، نیز ضرورت ہے کہ تمام تبلیغی جماعتیں اس کتاب کو دستور العمل کے طور پر اپنے لٹریچر میں شامل کریں، اور اپنے ہر مبلغ کو اس کا مطالعہ کرائیں۔ (م۔ت۔ع)

منتخبات من الأدب العربی مؤلفہ مولانا سید وصی مظہر ندوی، شائع کردہ مکتبہ اصلاح و تبلیغ حیدرآباد جامع مسجد روڈ حیدرآباد پاک، ۱۶۰ صفحات، کتابت و طباعت معمولی، کاغذ عمدہ قیمت درج نہیں۔

یہ ایک عربی ریڈر ہے، جو ادیب عربی کے امتحان کی تیاری کرنے والوں اور دینی مدارس کے ابتدائی درجات کے طلباء کے لئے لکھا گیا ہے، فاضل مؤلف نے اس میں ادب عربی سے نثر و نظم کے سادہ مگر فصیح ٹکڑے اس طرح جمع کر دئے ہیں کہ وہ طلباء کے لئے عربی زبان سیکھنے میں بھی ممد و معاون ہوں، اس میں ادبی ذوق بھی پیدا کریں، اور اپنے اسلامی اخلاق سے بھی روشناس کرائیں۔ آخر میں الفاظ کی ایک مفصل فرہنگ بھی ہے، یہ رسالہ عربی مدارس کے دوسرے درجے میں امدادی طور پر داخلِ نصاب بھی کیا جا سکتا ہے۔ (م۔ت۔ع)

سائنس دانوں کو دعوتِ حق۔ مرتبہ اسد اللہ خاں بی ایس سی علیگ، ناشر بارگاہ ادب۔ اکبر روڈ

کراچی ملا صفحات ۲، کاغذ رف کتابت وطباعت متوسط قیمت درج نہیں۔

اس چھوٹے سے رسالے میں قرآن کریم کی ان آیات کا ترجمہ جمع کر دیا گیا ہے۔ جن کا تعلق کسی نہ کسی درجے میں سائنس سے نکل سکتا ہے، قرآن کریم اگرچہ سائنس کی کتاب نہیں، نہ اس کی تعلیم اس کا مقصدِ نزول ہے۔ مگر اس فن کی رہنمائی کے لئے بھی اس کی بہت سی آیات سے روشنی ملتی ہے، ایسی ہی آیات اس میں جمع کی گئی ہیں۔ ترجمہ مولانا فتح محمد صاحبؒ سے لیا ہے۔ (م۔ت۔ع)

فیضِ سبحانی

شائع کردہ انجمن فلاح المسلمین کاغذی بازار کراچی ۲ صفحات ٦٤ مفت تقسیم کے لئے۔

اس رسالہ میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے کچھ مواعظ جمع کئے گئے ہیں، لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ ان کا ماخذ کیا ہے؟ اور مرتب کون ہے؟ بہرکیف! مفید رسالہ ہے، مذکورہ بالا پتے پر ایک کارڈ لکھکر مفت طلب کیا جاسکتا ہے۔

(م۔ت۔ع)

"دوزخ کے دہانے سے واپسی"

مجھے محکمہ سیٹلمنٹ میں ملازم ہوئے ابھی چند روز ہوئے تھے۔ ایک دن حسب معمول میں دفتر میں کام کر رہا تھا کہ ایک بڑے میاں آئے اور نہایت خوشامدانہ لہجہ میں مجھ سے کہنے لگے "بیٹا میرے مکان کا کلیم گم ہو گیا ہے، اور کل عدالت میں مجھے اس کی نقل پیش کرنی ہے۔ اسلئے اپنے ریکارڈ سے کاپی نکالدو تاکہ اسکی نقل کرواکے عدالت میں پیش کرسکوں"

"پچاس روپے لگیں گے.....!" میں نے اسکی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں، پچاس روپے کہاں سے لاؤں.....!؟" اس نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔ "جیب خالی ہے تو میں کیا کروں.......!؟" میں نے ترشروئی سے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر دیکھا تو وہ جا چکے تھے۔

دوسرے روز میں ابھی دفتر میں داخل ہوا ہی تھا کہ وہی بڑے میاں آئے اور پچاس روپے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "لو بابو جی! اب تو کام ہو جائے گا!" قبل اس کے کہ میں انہیں کچھ جواب دیتا میری نظر ان کے چہرے پڑی بڑے میاں کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل ڈاڑھی میں جذب ہو رہے تھے اور وہ انہیں صاف کرنے کی کوشش میں مصروف تھے میں نے رونے کی وجہ پوچھی، پہلے تو وہ پس وپیش کرتے رہے، مگر میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ کل یہاں سے جاکر اپنی جواں سال بیٹی کے بندے، جو میں نے چند آنے روزانہ کی بچت کرکے اسکی شادی کے لیے بنوائے تھے، فروخت کردیئے تاکہ آپ کا خرچ پورا کرسکوں"۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔

میں نے اٹھ کر فائل سے اس کی کاپی نکال دی اور جبراً وہ نوٹ ان کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی رشوت نہ لوں گا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بڑے میاں کے ضعیف و ناتواں بازوؤں نے مجھے دوزخ کے دہانے سے کھینچ لیا ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اَلرَّاشِیْ وَالْمُرْتَشِیْ کِلَاھُمَا فِی النَّارِ"

رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں دوزخی ہیں۔

(مرسلہ حافظ عتیق۔ جالندھری۔ سکھر)